اس شمارے میں

حرف اول

زکوٰۃ — فی سبیل اللہ کی مد اور مسئلہ تملیک — حافظ عاطف وحید — 2

حصہ اوّل

پہلی تحریر

زکوٰۃ سے متعلق چند تصریحات — ادارہ ترجمان القرآن — 5

دوسری تحریر

حضرات علماء کرام کی خدمت میں چند سوالات — خان محمد ربانی — 12

تیسری تحریر

زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک — سید ابوالاعلیٰ مودودی — 17

چوتھی تحریر

احکام زکوٰۃ — مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی — 22

پانچویں تحریر

مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل — مولانا امین احسن اصلاحی — 34

حصہ دوم

''مصارف زکوٰۃ'' — استفتاء اور جواب — 79

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

دار العلوم القرآن
نمبر 11.7.06

حکمتِ قرآن

ماہنامہ لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:

حافظ عاطف وحید۔ حافظ محمد زبیر

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۵ | جمادی الاخریٰ ۱۴۲۷ھ۔ جولائی ۲۰۰۶ء | شمارہ ۷

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-5869501
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
سالانہ زرتعاون: 100 روپے' فی شمارہ: 10 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے
[اس شمارے کی قیمت: 20 روپے]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زکوٰۃ — فی سبیل اللہ کی مد اور مسئلۂ تملیک

زکوٰۃ کی رقم کے استعمال کا معاملہ تقریباً تمام اسلامی احیائی تحریکوں میں ایک اہم اور قابل تصفیہ عُقدہ رہا ہے۔ تقریباً ہر تحریک میں تحریکی قیادت کے ہاں یہ فکر پیدا ہوئی کہ آیا اس تحریک کا کام مجملہ 'جہاد فی سبیل اللہ' کے ذیل میں آتا ہے یا نہیں —— اور کیا قرآن کے مختص کردہ آٹھ مصارفِ زکوٰۃ میں سے 'فی سبیل اللہ' کی مد کا اطلاق ان کی جدوجہد پر کرنا مطابقِ منشائے شریعت ہے یا نہیں؟

تنظیم اسلامی اور انجمن ہائے خدام القرآن کے حلقوں میں بھی اس بارے میں مختلف مواقع پر بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ سال ۲۰۰۴ء میں یہ بحث ایک مرتبہ پھر بھرپور انداز میں اُٹھی۔ چنانچہ اس ضمن میں متعدد مقالات تصنیف کیے گئے —— اور 'فی سبیل اللہ' کے حوالے سے تین موقف پیش کیے گئے۔ ایک موقف 'فی سبیل اللہ' کے بارے میں اس حد تک توسّع اور تعمیم کا تھا کہ دین کی خدمت کے اعتبار سے جو کام بھی کیے جائیں' چاہے وہ دعوت و تبلیغ کی نوعیت کے ہوں' اشاعت و طباعت کے ہوں یا تعلّم و تعلیمِ دین کے' وہ سب 'فی سبیل اللہ' ہونے کی بنا پر اس لائق قرار دیے گئے کہ زکوٰۃ کی رقم سے ان کے اخراجات پورے کیے جانا درست قرار پایا۔ دوسرا موقف اس کے بالکل برعکس سامنے آیا۔ اس موقف کے قائل حضرات نے 'فی سبیل اللہ' کو صرف 'قتال فی سبیل اللہ' تک ہی محدود کرنے کو ضروری خیال کیا۔ ان حضرات کے پاس اس بارے میں سب سے قوی اور مؤثر دلیل یہ ہے کہ اہل سنت کے مذاہبِ اربعہ کا مفتیٰ بہ قول یہی ہے' اگرچہ اہل سنت کے ہاں 'فی سبیل اللہ' کے حوالے سے دوسرے اقوال بھی ملتے ہیں۔ تیسرا نقطۂ نظر بین بین ہے۔ اس رائے کے حاملین 'فی سبیل اللہ' کو جہاد فی سبیل اللہ کے معنی میں لیتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ جہاد اپنے درجات اور مراحل کے اعتبار سے عسکری نوعیت کا بھی ہوتا ہے اور نظری و فکری بھی۔ تاہم جہاد کی یہ تمام اقسام 'جہاد فی سبیل اللہ' صرف اُسی وقت کہلائیں گی جب یہ

جدوجُہد خالصتاً اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد سے کی گئی ہو۔ ان مقالات میں سے چند منتخب مقالات ۲۰۰۴ء میں اپریل' مئی' جون' جولائی اور ستمبر کے حکمتِ قرآن میں شائع کیے جا چکے ہیں۔ قصہ مختصر' اس تمام علمی مباحثہ کے نتیجے میں تنظیم اسلامی اور انجمن ہائے خدام القرآن کی سطح پر زکوٰۃ کے استعمال کے حوالے سے ایک فیصلہ ایک سال قبل کر لیا گیا تھا۔ تاہم موضوع کی اہمیت کے پیش نظر صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدّ ظلہٗ کی خصوصی ہدایت پر حکمت قرآن کے زیر نظر شمارے میں اس مسئلہ سے متعلق بعض اور اہم تحریریں بھی قارئین کی دلچسپی کی خاطر پیش کی جا رہی ہیں۔

اس شمارے کے مضامین دو حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ پہلا حصہ تمام کا تمام تحریک جماعت اسلامی کے official مجلّہ ماہنامہ ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔ تمام مضامین اسی ترتیب کے ساتھ ہیں جس میں وہ اس مؤقر جریدے میں شائع ہوئے۔ حتیٰ کہ مضامین کے ساتھ ادارتی نوٹ بھی شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ قارئین پوری طرح اس پس منظر سے آگاہ ہو جائیں جن میں وہ اصلاً شائع ہوئے تھے۔ اس حصے میں جو مقالات شامل ہیں ان میں بنیادی طور پر تین امور پر بحث کی گئی ہے۔ ایک احیائی تحریک ہونے کی نسبت سے جماعت کے دعوتی' تبلیغی اور انتظامی معاملات پر اُٹھنے والے اخراجات کے لیے دیگر وسائل کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی رقم بھی آمدن کا ایک اہم جزو رہی ہے۔ آٹھ مصارفِ زکوٰۃ میں سے 'فی سبیل اللہ' کی مد میں وصول ہونے والی رقم کے استعمال کو امیرِ جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور نے جماعت کی متنوع ضروریات کے لیے اس بنا پر درست قرار دیا تھا کہ جماعت کی تمام مساعی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق 'جہاد فی سبیل اللہ' سے جُڑتا تھا۔ زکوٰۃ کی اس وصولی کے حوالے سے معترضین نے تین اہم اشکالات پیش کیے۔ ایک یہ کہ کیا جماعت کی جملہ مساعی اور اہداف کو 'جہاد فی سبیل اللہ' کی اُس تعریف میں شمار کرنا درست ہے جو اسے 'فی سبیل اللہ' کی اہم مدّ میں زکوٰۃ کی وصولی کا اہل بناتی ہوں؟ دوسرے یہ کہ کیا جماعت کے زکوٰۃ وصول کنندگان اور تقسیم کنندگان کے لیے 'عاملین علیہا' کا اطلاق اُسی طرح درست ہوگا جیسے کسی اسلامی ریاست کے لیے ہوتا ہے؟ اور تیسرا مسئلہ جو دوسرے مسئلے سے متصل اور جڑا ہوا ہے' وہ یہ کہ کیا جماعت کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے تملیک کا وہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے جو اسلامی فقہ میں قدیمی بھی ہے اور مختلف فیہ بھی؟

متذکرہ بالا امور پر ایک استفسار کے جواب میں امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مقالہ سامنے آیا جس میں انہوں نے توسّع کی حمایت میں اپنے موقف کی وضاحت فرمائی۔ اس پر مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ نے اسلاف کے نقطۂ نظر کا دفاع کرتے ہوئے جواباً مقالہ تحریر فرمایا جس میں مولانا مودودی کے موقف پر علمی اور تعمیری انداز میں تنقید کی گئی تھی۔ ان مقالات کے چھپ جانے کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم' جو اُس وقت جماعتِ اسلامی میں نہ صرف شامل تھے بلکہ اپنے علمی مقام و مرتبہ کی بنا پر امیر جماعت کے قدم بقدم جماعت کو فکری رہنمائی فراہم کرنے کا اہم فریضہ بھی انجام دے رہے تھے' کا پُرجوش قلم حرکت میں آیا اور انہوں نے دو اقساط میں 'مسئلۂ تملیک' کے ذیل میں اِن تمام امور پر مفصل مقالہ تحریر فرما دیا۔ اس طرح 'thesis'، 'antithesis' اور 'synthesis' کی شکل میں ایسی نادر علمی تحریریں وجود میں آگئیں جو اسلامی تحریکات کے تمام وابستگان کے لیے بیش قیمت تحفے کا درجہ رکھتی ہیں۔

دوسرے حصے میں تین تحریریں ہیں جو اصلاً 'فتاویٰ' ہیں لیکن اس انداز سے تحریر کیے گئے ہیں کہ وہ بھی تحقیقی مضمون نظر آتے ہیں۔ یہ تینوں فتاویٰ اُس فکر کی نمائندہ تحریریں ہیں جو حنفی دیوبندی مسلک کے مراکز اور دارالافتاء میں رائج ہے۔ یادش بخیر' اسی موقف کی تائید پر مبنی ایک مبسوط مقالہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فاضل استاد مولانا عتیق احمد بستوی نے بھی تحریر فرمایا تھا جو آٹھ اقساط میں ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ کے ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔ یہ دونوں حصے مل کر 'فی سبیل اللہ' کی مد کو دو مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس انداز سے واضح کرتے ہیں کہ 'فی سبیل اللہ' لازماً 'جہاد فی سبیل اللہ' ہی رہے اور ہر کارِ خیر پر محیط نہ سمجھا جائے!

اطلاع برائے قارئین

''حکمت قرآن'' کے زیرِ نظر شمارے کی حیثیت ''خصوصی اشاعت'' کی ہے اور یہ جولائی اور اگست ۲۰۰۶ء کے شماروں کے قائم مقام ہے۔ اس اعتبار سے اس کی ضخامت بھی دوگنا ہے۔

حصہ اوّل

پہلی تحریر:

زکوٰۃ سے متعلق چند تصریحات

(ترجمان القرآن، ذوالحجہ ۱۳۷۳ھ/ستمبر ۱۹۵۴ء)

سوال: جماعت اسلامی کے بیت المال کی وساطت سے جس طرح زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم ہوتی ہے، اس پر بعض اوقات دو اعتراض وارد کیے جاتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم جماعتی کاموں پر خرچ کر دی جاتی ہیں اور صاحبِ نصاب کارکنوں کو معاوضے اور تنخواہیں وغیرہ بھی اس مدّ میں سے دے دی جاتی ہیں، حالانکہ یہ زکوٰۃ کا کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کے لیے تملیک لازمی شرط ہے، یعنی جب تک زکوٰۃ دینے والا کسی مستحق شخص یا اشخاص کو زکوٰۃ کا کلیتاً مالک و متصرف نہ بنادے اُس وقت تک صحیح معنوں میں زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی۔ چونکہ جماعت کے بیت المال میں زکوٰۃ دیتے وقت کسی متعین فرد کو زکوٰۃ نہیں دی جاتی، اس لیے یہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی صحیح شکل نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان اعتراضات کی حقیقت کو واضح کیا جائے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط؟ اور مسئلہٴ تملیک کے علاوہ اس امر کی بھی وضاحت کی جائے کہ جماعتی کاموں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: زکوٰۃ کے مستحق ازروئے قرآن یہ ہیں: فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، الرقاب (غلام، قیدی وغیرہ)، الغارمین (ناگہانی قرض یا خسارے کے زیر بار)، فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) اور ابن السبیل (مسافر)۔ جماعت اسلامی کے بیت المال میں زکوٰۃ کی جو رقوم آتی ہیں ان میں سے فقراء، مساکین اور غارمین کی مدّ کے تحت عام غیر مستطیع مسلمانوں کو بھی زکوٰۃ دی جاتی ہے اور فی سبیل اللہ کی مدّ میں سے جماعت کے مختلف مصارف میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جاتی ہے۔ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد عام طور پر قتال فی سبیل اللہ مراد لیا جاتا ہے اور اس کا مصرف یہ بتایا جاتا ہے کہ جن مجاہدین کے ساز و سامان کا باقاعدہ انتظام نہ ہو انہیں سامانِ جہاد کی فراہمی کے لیے اس مدّ میں سے زکوٰۃ دی جانی چاہیے۔ لیکن قرآن مجید، احادیث و آثار اور اقوالِ ائمہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ

فی سبیل اللہ کا مفہوم اتنا محدود اور مخصوص نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔

قرآن مجید نے ''فی سبیل اللہ'' کی مد بیان کرتے وقت قتال کی قید نہیں لگائی' حالانکہ اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے دوسرے مقامات پر بالعموم جہاد فی سبیل اللہ' قتال فی سبیل اللہ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ دوسری طرف قرآن مجید میں جہاں صرف فی سبیل اللہ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی کو عام رکھا گیا ہے اور اسے مطلقاً جہاد یا قتال کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قتال کے علاوہ اطاعتِ الٰہی کے بہت سے ایسے کام ہیں جن کے ساتھ فی سبیل اللہ کی صفت لگائی گی ہے۔ احادیث میں سے جس حدیث سے بالخصوص یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے' وہ ابوداؤد' احمد اور حاکم کی یہ حدیث ہے:

((لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِغَازٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا اَوْ لِغَارِمٍ ..... الخ))

''صدقہ کسی غنی کے لیے جائز نہیں الا یہ کہ وہ اللہ کی راہ کا غازی ہو' یا زکوٰۃ کے سلسلے میں کارکن ہو یا مقروض و غارم ہو''۔

اس حدیث سے بلاشبہ یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ غازیٔ غنی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے' لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی سبیل اللہ کی مد سے صرف مجاہدین بالسیف ہی حصہ پا سکتے ہیں۔ بعض دوسری احادیث ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اس مد میں سے حاجیوں کو زکوٰۃ کے اونٹوں سے استفادے کی اجازت دی ہے' چنانچہ اسی بنا پر فقہائے حنفیہ میں سے امام محمدؒ' امام ابو یوسف اور حسنؒ فی سبیل اللہ کی مد سے حاجیوں کے زادِ راحلہ کا انتظام جائز قرار دیتے ہیں۔ بلکہ کتاب الخراج کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف نے اس مد کا مصرف ''اصلاح طرق مسلمین'' (سڑکوں کی مرمت) قرار دے کر اسے وسیع تر کر دیا ہے۔ اس مسلک کی تائید ایک صحابیؓ کے قول سے بھی ہوتی ہے جو کتاب الاموال لابی عبید کے ص ۵۷۴ پر منقول ہے' اور وہ یہ ہے:

عن انس بن مالك والحسن قالا ما اعطيتَ في الجسور والطرق فهي صدقة ماضية وقال اسماعيل انها تجزى من الزكوٰة

''انسؓ بن مالک اور حسنؒ نے فرمایا کہ جو کچھ تو پلوں اور سڑکوں کے لیے دے وہ بھی صدقہ ہے اور اسماعیل نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی''۔

شامی' جلد۲' ص ۲۵ میں طلبہ کو بھی ''فی سبیل اللہ'' میں شمار کیا گیا ہے' خواہ وہ صاحبِ نصاب ہوں۔ علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں ''فی سبیل اللہ'' کی تفسیر میں حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قیل المراد طلبة العلم واقتصر علیه فی الفتاوی الظهیریة وفسّره فی البدائع بجمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة الله تعالیٰ وسبل الخیرات

''اس سے طالب علم بھی مراد لیے گئے ہیں۔ فتاویٰ ظہیریہ میں اس مدّ کو طلبہ تک ہی محدود کیا گیا ہے' لیکن بدائع الصنائع میں اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس میں اللہ سے قریب لانے والے سارے کام شامل ہیں۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے راستے میں دوڑ دھوپ کرے گا وہ اس میں داخل ہے۔''

احناف کے علاوہ دیگر مذاہب بھی اس مدّ کو مقاتلین تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس میں وسعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ ابن عربی مالکی ''احکام القرآن'' میں فی سبیل اللہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

قال مالکٌ سبل الله کثیر ۔ احمد واسحاق قالا انه الحج والذی یصحّ عندی من قولهما ان الحج من جملة السبل مع الغزو

''امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سُبل اللہ یعنی اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ احمد اور اسحاق نے فرمایا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد حج ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح مطلب یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے''۔

دیارِ ہند و پاکستان کے متعدد علماء نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد دین کے تحت ساری علمی و عملی سرگرمیاں ہیں۔ چنانچہ سیرت النبیؐ جلد ۵ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں کہ ''اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے' مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر آیت گزر چکی ہے: ﴿لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ یہاں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد بالاتفاق جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دین کا کام مراد ہے۔'' مولانا عبدالصمد رحمانی (امارتِ شرعیہ بہار) نے اپنی ایک تالیف ''کتاب العشر والزکوٰۃ'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے بھی فی سبیل اللہ کی مدّ میں ایسے لوگوں کو شمار کیا ہے جو دین

کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔

جماعت اسلامی کے اہل علم کا مسلک اس بارے میں اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے جو مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے مشورے سے حکومت کے ایک سوالنامے کے جواب میں ترجمان میں دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ''فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے خواہ وہ تلوار سے ہو یا قلم وزبان سے یا ہاتھ پاؤں کی دوڑ دھوپ اور محنت سے۔ سلف کے نزدیک اس کا مفہوم ان مساعی تک محدود ہے جو خدا کے دین کو قائم کرنے' اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی ممالک کا دفاع کرنے کے لیے کی جائیں''۔

جماعت اسلامی کا مقصدِ وحید اقامتِ دین ہے اور جماعت پوری کوشش کرتی ہے کہ اس کی اور اس کے کارکنوں کی سرگرمیاں اسی مقصد کے لیے وقف رہیں۔ مخیّر حضرات کا بھی یہ کام ہے کہ وہ اپنی جگہ پر اس امر کا اطمینان کر لیں کہ آیا اس جماعت کے متفرق اور متنوّع مشاغل اقامتِ دین اور فی سبیل اللہ کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ اگر انہیں یہ اطمینان حاصل ہو جائے تو وہ اپنی زکوٰۃ جماعت کے بیت المال میں جمع کرا سکتے ہیں اور اگر یہ اطمینان حاصل نہ ہو تو وہ مختار ہیں' جہاں چاہیں اپنی زکوٰۃ دیں۔

جو اعتراض تملیک کے سلسلے میں کیا جاتا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک شخصی تملیک ادائے زکوٰۃ کے لیے شرطِ لازم نہیں ہے۔ عموماً لِلْفُقَرَاءِ کے ''لام'' کو لامِ تملیک قرار دے کر اس سے وجوبِ تملیک کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے' مگر کلامِ عرب میں حرفِ لام صرف انہی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا' بلکہ یہ حرف کئی مرتبہ تملیک کے بجائے انتفاع کے معنی دیتا ہے' مثلاً: ﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ (الآیۃ)۔ پھر تملیکِ شخصی کی شرط کو اگر ضروری بھی سمجھا جائے تو یہ اسی صورت میں ممکن العمل ہے جبکہ مسلمانوں کی کوئی ایسی ہیئت حاکمہ یا ہیئتِ اجتماعیہ موجود نہ ہو جو ساری زکوٰۃ کو وصول کرتی ہو۔ لیکن ایک اسلامی حکومت کے بیت المال میں جب زکوٰۃ اپنی مطلوب اور مشروع شکل میں ادا کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں شخصی تملیک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر اجتماعی حیثیت میں زکوٰۃ کی وصولی کے بعد ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کو کسی ایسے اجتماعی مصرف میں لگا دے جس کا فائدہ بحیثیت مجموعی مستحقین کو پہنچے تو یہ بھی زکوٰۃ کی تقسیم کی ایک بالکل جائز شکل ہوگی۔ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں اگر مسلمانوں کا کوئی دینی وملی ادارہ اسی طرز پر زکوٰۃ کی اجتماعی تحصیل وتقسیم کا انتظام کرے تو شرعاً اس پر بھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر

ہے کہ جماعت اسلامی کے علاوہ اور بھی بہت سی جماعتیں اور ادارے بھی اپنی ہر طرح کی ضروریات پر زکوٰۃ کی رقوم اُسی طرح خرچ کرتے ہیں جس طرح جماعت اسلامی خرچ کرتی ہے' لیکن ان میں سے بعض کے نزدیک انفرادی تملیک شرط ہے۔ چنانچہ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ آنے پر پہلے اسے ادارے کے نادار افراد کے سپرد کیا جاتا ہے اور پھر فوراً ان سے لے کر اجتماعی فنڈ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حیلہ ایک غیر ضروری اور خواہ مخواہ کا تکلف ہے اور اس میں تملیک کی صورت سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ لین دین پہلے سے طے شدہ اور بالکل نمائشی ہوتا ہے' دائمی اور حقیقی تملیک ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔

یہاں ایک اور بات کو بھی صاف کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے سوالات سے گمان ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں زکوٰۃ ہر حالت میں اُسی کو دی جانی چاہیے جو صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ قید فقیر و مسکین کے لیے تو ایک حد تک درست ہے' لیکن دوسری مدات میں بھی اگر یہ شرط لازم ٹھہرا دی جائے تو پھر مزید چھ مدات کو الگ الگ رکھنے کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے' کیونکہ جو صاحبِ نصاب نہیں ہوگا وہ بہرحال فقراء و مساکین کے زمرے میں داخل ہو کر مستحقِ زکوٰۃ ہو ہی جائے گا۔ اس کے لیے کسی دوسری بنائے استحقاق کے ذکر کرنے یا ملحوظ رکھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر ایک آدمی کو ایک سے زائد وجوہ زکوٰۃ کا حق دار بنا دیں تو بلاشبہ اس کا حق فائق ہوگا۔ لیکن یہ امر تو احادیث سے بصراحت ثابت ہے کہ فقر و مسکنت کے علاوہ دوسری منصوص صفات جس شخص کو مستحق زکوٰۃ بناتی ہیں وہ شخص صاحبِ نصاب اور غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک حدیث اوپر نقل کی جا چکی ہے۔

آخر میں یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ زکوٰۃ جماعت اسلامی کے بیت المال کا واحد ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ جماعت کی آمد کے متعدد ذرائع ہیں' ان میں کتب و رسائل کی آمدنی بھی ہے' ارکان و متفقین کی خصوصی اعانتیں بھی ہیں اور عام اہل خیر کے عطیات بھی ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ جماعت کے بالمعاوضہ کارکن اپنی تنخواہیں زکوٰۃ سے لے رہے ہیں یا جماعت کے دوسرے سارے کام زکوٰۃ کے بل پر چل رہے ہیں۔ اب تو بفضلہٖ یہ صورت ہے کہ متعدد بڑے بڑے شہروں میں خیراتی شفاخانے قائم ہیں اور زکوٰۃ و صدقات زیادہ تر ان پر صرف ہو رہے ہیں۔ بیت المال میں اگر زکوٰۃ آتی ہے تو اس کا

باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا ہے اور اعانتِ فقراء و مساکین پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا بھی الگ حساب رکھا جاتا ہے۔ جماعت کے دیگر مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ زکوٰۃ کی بقیہ رقم اگر ان میں خرچ ہو تب بھی وہ ان مصارف کا ایک معمولی جزو بنتی ہے۔ اس لیے اس امر کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا کہ زکوٰۃ اپنے صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو۔

''زکوٰۃ سے متعلق تصریحات'' پر استدراک

(ترجمان القرآن' صفر ۱۳۷۴ھ/نومبر ۱۹۵۴ء)

قارئینِ ترجمان میں سے ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''رسائل و مسائل کے باب میں ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ کے پرچے میں زکوٰۃ کے مصارف بیان کرتے ہوئے دو کتابوں کے حوالہ جات تحریر کیے گئے ہیں۔ دونوں میں آپ نے کچھ لفظ کاٹ دیے ہیں۔ ''روح المعانی'' کی عبارت میں لفظ ''فقیر'' کاٹ دیا ہے اور ''بدائع الصنائع'' کے حوالے میں لفظ 'محتاج'' کاٹ دیا ہے۔ نظرِ ثانی فرما کر تصحیح فرمائیں''۔

ہم صاحب خط کے توجہ دلانے پر اُن کے شکر گزار ہیں لیکن ان کی شکایت غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک ''بدائع الصنائع'' کے حوالے کا تعلق ہے وہ ہم نے الگ اصل کتاب سے نقل نہیں کیا تھا' بلکہ ''فی سبیل اللہ'' کی تفسیر میں صاحبِ روح المعانی نے جو اقوال نقل کیے ہیں ہم نے طولِ بحث سے بچتے ہوئے ان میں سے چند ایک کو نقل کر دیا تھا۔ انہی میں سے ایک قول صاحب البدائع کا بھی تھا۔ خط آنے پر جب اصل کتاب ''بدائع'' کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ''فی سبیل اللہ'' کی تعریف کے ساتھ **اذا کان محتاجًا** کے لفظ تھے' مگر روح المعانی میں یہ الفاظ نقل نہیں کیے گئے اور اسی وجہ سے ہمارے حوالے میں بھی یہ الفاظ درج نہیں ہو سکے۔ ہم نے قصداً کسی لفظ کو کاٹنے یا چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح روح المعانی کا بقیہ حوالہ جتنا ہم نے نقل کیا ہے اُس میں سے ہم نے کوئی لفظ کاٹا نہیں تھا۔ البتہ البحر النہایہ اور احکام القرآن کے حوالوں کو بھی ہم نے صرف اختصار کے پیشِ نظر حذف کر دیا تھا۔ ان سارے حوالوں کے نقل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس مقام پر انہیں نقل کیا جا رہا تھا وہاں اصل چیز جو معرضِ بحث تھی وہ یہ تھی کہ آیا ''فی سبیل اللہ'' سے مراد محض قتال فی سبیل اللہ ہے یا اس میں نیکی اور بھلائی کے دوسرے کام بھی شامل ہیں۔ اس لیے جو حوالے براہِ راست اس بحث سے متعلق تھے اُن میں سے چند ایک کو نقل کر دیا گیا اور بقیہ کو چھوڑ دیا گیا۔

یہاں ہم مکتوب نگار کی خدمت میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ فقہائے احناف نے بالعموم فقراء و مساکین کی مدّات کے علاوہ دیگر مدّات کے ساتھ بھی فقر و احتیاج کی جو قید لگائی ہے' اگر اس سے یہ مراد لیا جائے کہ مثلاً ایک شخص ایک کام جو ''فی سبیل اللہ'' کے تحت ہے یا حج یا جہاد پر جانا چاہتا ہے اُس کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ نصاب بھی نہ ہو تو ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ بلاشبہ کتبِ حنفیہ کو دیکھنے سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اس بارے میں حنفیہ اور شافعیہ میں کچھ اختلاف ہے اور شافعیہ فی سبیل اللہ اور ابن السبیل وغیرہ کی مدّات میں سے غنی اور غیر محتاج کو دینا بھی جائز سمجھتے ہیں اور حنفیہ شرطِ احتیاج کو لازم قرار دیتے ہیں۔ لیکن احناف کے مسلک کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ کا حق دار بننے کے لیے جس قسم کی حاجت مندی کی قید وہ فقراء و مساکین کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے عائد کرتے ہیں' وہ حاجت اس طرح کی نہیں ہے جس طرح کی فقیر یا مسکین کو گھر بیٹھے بھی لاحق ہوتی ہے' بلکہ وہ حاجت ایسی ہے جو ''اللہ کی راہ میں'' ہی لاحق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص گھر میں کھاتا پیتا ہے' فقیر اور محتاج نہیں ہے' بلکہ اس کی زندگی کی ساری ضروریات فراہم ہو رہی ہیں۔ یہی شخص اگر جہاد میں جانا چاہتا ہے' حج پر جانا چاہتا ہے' یا اللہ کی راہ میں اور ''سبل الخیرات'' کے سلسلے میں کوئی اور جدوجہد کرنا چاہتا ہے تو عین ممکن ہے کہ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے جس سروسامان اور جن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں وہ از خود مہیا نہ کر سکتا ہو۔ ایسا شخص فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ درحقیقت ایسا شخص ایک جہت سے غنی اور ایک جہت سے محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ اسے محتاج قرار دے کر زکوٰۃ کا حق دار سمجھتے ہیں اور شافعیہ اسے غنی قرار دے کر بھی اس کے لیے زکوٰۃ کا لینا جائز قرار دیتے ہیں۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو فقہاء کی نزاع لفظی رہ جاتی ہے اور احناف اور دیگر فقہاء کے مابین کوئی حقیقی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

اگر دوبارہ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو احکام القرآن اور خصوصاً بدائع الصنائع کی وہ پوری بحث نقل کر دی جاتی جو مذکورہ بالا تشریح کی تائید کرتی ہے۔ بہرکیف مسلک حنفی میں فقراء و مساکین کے دوسری مدّات کے ساتھ احتیاج کی جو قید لگائی گئی ہے اس کی صحیح تاویل یہی ہے۔ اگر اس کی اور تاویل کی جائے گی تو وہ **لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِغَازٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** ..... الخ والی حدیث کے خلاف پڑے گی۔ (غ۔ع)

❁ ❁ ❁

دوسری تحریر:

حضرات علماء کرام کی خدمت میں چند سوالات

جناب خان محمد صاحب ربانی

(ترجمان القرآن' محرم ۱۳۷۴ھ/ اکتوبر ۱۹۵۴ء)

گزشتہ عید الاضحیٰ کے موقعہ پر جماعت اسلامی ملتان شہر کی طرف سے خیراتی شفاخانے کے لیے قربانی کی کھالیں جمع کرنے کی ایک مہم شروع کی گئی تھی۔ بعض مخالفین نے اس مقصد کو نقصان پہنچانے کے لیے ملتان کے مقامی علماء سے ایک استفتاء کیا جس میں زکوٰۃ' فطرانہ' قیمتِ چرم ہائے قربانی وغیرہ صدقاتِ واجبہ کے مصرف کے بارے میں یہ پوچھا گیا کہ مساجد و مدرسہ جات اور رفاہِ عام کے دوسرے اداروں پر ان رقوم کو خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سلسلہ میں جماعت کے شفاخانوں کے مصارف یعنی ادویات کا خرچ' طبی عملہ کی تنخواہیں' موٹر کی مرمت' ڈرائیور کے معاوضہ اور پٹرول کی قیمت پر ان رقوم کے خرچ کے جواز کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔

فتویٰ تحریر کرنے والے مفتی صاحب نے وضاحت سے تمام سوالات کا جواب دینے کے بجائے مجملاً یہ لکھ دیا کہ ان سوالات میں جتنے مصارف مذکور ہیں' تقریباً سب میں تملیکِ شرعی نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا زکوٰۃ' فطرانہ' قیمتِ چرم ہائے قربانی وغیرہ کو ایسے مصارف میں صرف کرنا ناجائز ہے۔ اس جواب پر باقی مقامی علماء نے صاد کر دیا اور مستفتی نے اسے شائع کر کے عام لوگوں میں پھیلا دیا' تاکہ عوام الناس استفتاء اور فتویٰ کی غیر واضح عبارت سے اس دھوکا میں آ جائیں کہ خیراتی شفاخانے کے لیے چرم ہائے قربانی' زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم دینا ناجائز ہے۔

بہرحال علماءِ کرام کے اس فتوے سے بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایک الجھن سی پیدا ہو گئی ہے' اور مختلف حلقوں میں مختلف قسم کے اعتراضات اور سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ ذیل میں ان اعتراضات اور سوالات کا ایک خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ اور ان مذکورۂ بالا علماء سے خصوصاً اور دوسرے اکابر علماء سے عموماً یہ گزارش کی جاتی ہے کہ براہِ کرم اس مسئلے کو اچھی طرح صاف کر دیں' تاکہ آئندہ ہر بقرعید کے موقعہ پر اس قسم کے فتوے اور اشتہار نکلنے سے خواہ مخواہ دین دار طبقوں کو پریشانی پیش نہ آئے اور بے دین طبقوں کو دین اور اہل دین کا

مذاق اڑانے کے مواقع نہ ملیں۔

بنیادی اعتراض یہ ہے کہ فقہ حنفی میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک کی جو شرط لگائی ہے اور اس شرط کی بنا پر جو فروعی احکام علما اور فقہاء اپنے فتووں میں بیان کرتے ہیں وہ صرف اسی صورت میں قابل عمل ہیں جبکہ لوگ انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ نکال کر انفرادی طور پر ہی اس کو صرف کر دیں' لیکن اگر اجتماعی طور پر مثلاً اسلامی حکومت کے ذریعہ سے اس کو وصول اور صرف کرنے کا انتظام کیا جائے تو یہ شرط اپنے ان جزئی احکام کے ساتھ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔

قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کے لیے صحیح صورت اجتماعی تنظیم ہی ہے' نہ کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنا اور بطور خود تقسیم کر دینا۔ یہ آخری صورت تو محض اس مجبوری کی حالت کے لیے ہے جبکہ مسلمانوں کے اندر کوئی اجتماعی نظم اس خدمت کی انجام دہی کے لیے موجود نہ ہو۔ ورنہ شریعت کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انتظام اجتماعی طور پر ہونا چاہیے۔ جیسا کہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ .....الخ میں وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کی مدّ رکھنے سے معلوم ہوتا ہے' اور جیسا کہ نبی ﷺ کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کا باقاعدہ نظم قائم فرمایا تھا' اور جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل اور صحابہؓ کے اس پر اجماع سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلامی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا ان کے خلاف جنگ کی گئی۔

اب اگر یہ مسلّم ہے کہ زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کے لیے صحیح صورت اجتماعی تحصیل وتقسیم ہی ہے تو براہِ کرام یہ بتایا جائے کہ اس اجتماعی نظم کی صورت میں تملیک کی یہ شرط اپنے جزئی احکام کے ساتھ کیسے قابل عمل ہو سکتی ہے؟ اس سوال کی توضیح کے لیے ہم چند عملی مسائل پیش کر کے علماء سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کا جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) زرعی پیداوار اور مواشی کی زکوٰۃ ظاہر ہے کہ ایک ایک گاؤں اور ایک ایک چراگاہ سے وصول کی جائے گی' اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طرح زکوٰۃ میں جو مختلف قسم کے حبوب' غلے اور جانور وصول ہوں گے وہ اسی وقت' اُسی جگہ' اُسی شکل میں مقامی مستحقین کے درمیان سب کے سب تقسیم نہیں ہو جائیں گے۔ اُن کے بہت بڑے حصے کو تحصیل' ضلع یا صوبے کے مرکزی بیت المال میں منتقل کرنا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کے حمل ونقل کے لیے جو چھکڑے' لاریاں اور ٹرک وغیرہ استعمال کیے جائیں گے' اُن کی قیمت' اُن کے ڈرائیوروں کی تنخواہیں' اُن کے پٹرول وغیرہ کے مصارف آیا زکوٰۃ ہی کی مدّ سے دیے جائیں گے یا کسی

اور مدّ سے؟ اور مرکزی مقامات کے بیت المالوں میں ان چیزوں کو رکھنے کے لیے جو ڈپو' ذخیرہ گاہیں اور جانوروں کے باڑے تعمیر کیے جائیں گے' اُن کا خرچ اور اُن کے کارکنوں کا خرچ کس مدّ سے ادا کیا جائے گا؟

(۲) زیورات' سونے چاندی' تجارتی اموال اور کارخانوں اور کمپنیوں وغیرہ کی جو زکوٰۃ حکماً یا طوعاً مختلف مقامات سے وصول ہوگی وہ بھی لازماً ساری کی ساری اُسی جگہ صرف نہیں ہو جائے گی جہاں سے وہ وصول ہوگی۔ اُس کا اچھا خاصا حصہ بھی لامحالہ اُن مراکز پر منتقل ہو جائے گا جو زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے مقرر کیے جائیں گے۔ اس دولت کو منتقل کرنے کے مصارف کس مد سے ادا کیے جائیں گے؟ کیا مثلاً ڈاک خانے کو منی آرڈر کی فیس ادا کرنا زکوٰۃ کا صحیح مصرف ہوگا؟ یا جو لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ خزانے کی رقمیں لے جائیں گے وہ ریل کا کرایہ زکوٰۃ کی مدّ سے لے سکیں گے؟

(۳) پھر جو رقوم' اجناس اور مواشی اس طور پر جمع ہوں گے' کیا یہ لازم ہوگا کہ ان میں سے ہر چیز کو اسی شکل میں تقسیم کر دیا جائے جس شکل میں وہ وصول ہو؟ کیا مواشی کو بیچ کر اُن کی قیمت بیت المال میں جمع کر لینا یا ضرورت سے زائد چاول فروخت کر کے حسبِ ضرورت گندم خرید لینا' یا وصول شدہ کپاس کو قابل استعمال روئی میں تبدیل کرا لینا یا روغنی بیجوں کا تیل نکلوا کر رکھنا شرعاً ممنوع ہوگا؟ اگر یہ ممنوع نہیں ہے تو ان مختلف کاموں کے مصارف کون ادا کرے گا اور کس مدّ سے ادا کرے گا؟

(۴) فرض کیجیے کسی علاقے میں قحط برپا ہے اور حکومت پورے ملک کی فاضل زکوٰۃ اس قحط زدہ علاقے کے محتاج لوگوں پر صرف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اسے پہلا کام تو یہ کرنا ہوگا کہ تمام بیت المالوں کے ذخائر میں سے جمع شدہ غلہ وہاں بھیج دے۔ لیکن یہ اس کے بغیر نہ ہو سکے گا کہ زکوٰۃ کی مدّ سے ہزاروں روپے اس غلے کو منتقل کرنے کے لیے ریلوں اور ٹرکوں اور حمالوں کی مزدوریوں اور بوریوں کی قیمت پر صرف کیے جائیں۔ پھر جب یہ غلہ بھی کافی نہ ہوگا تو حکومت کو وہاں مزید غلہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس صورت میں تملیک کی شرط کا منشا تو یہ ہے کہ غلہ کسی اور مدّ سے خرید کر وہاں بھیجا جائے اور ایک ایک قحط زدہ آدمی کو زکوٰۃ کا روپیہ دے کر اس سے کہا جائے کہ اب تجھے اختیار ہے' چاہے غلہ خرید لے اور چاہے کسی اور مدّ میں استعمال کر۔ لیکن قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مد سے مختلف علاقوں اور ملکوں کا غلہ خرید خرید کر وہاں بھیجا جائے اور قحط زدہ لوگوں

میں نہ صرف غلہ تقسیم کیا جائے' بلکہ روٹیاں تک پکوا کر تقسیم کی جائیں تا کہ بھوک سے مرتے ہوئے آدمیوں کو بروقت تیار شدہ غذا مل سکے۔ کیا ایسا کرنا تملیک کی شرط کے ساتھ ممکن ہوگا؟ پنجاب و بنگال کے موجودہ سیلاب میں اگر زکوٰۃ کے بیت المال سے کوئی مدد پہنچائی جاتی تو تملیک کی شرط کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا' سوائے اس کے کہ روپیہ سیلاب زدہ لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور اُن سے کہا جاتا کہ اب اپنی ضروریات جہاں سے ملیں فراہم کر لو۔ حالانکہ ضرورت کی تمام اہم چیزیں بروقت صرف اسی طرح پہنچ سکتی ہیں کہ ہوائی جہازوں پر سامان' دوائیں اور کارکن بھیجے جائیں۔

(۵) زکوٰۃ کے مستحقین میں سے ایک قسم کے مستحق مسافر بھی ہیں۔ تملیک کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسافر کو زکوٰۃ کی مد سے روپیہ دے دیا جائے' اور اس سے کہا جائے کہ جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے' جا پڑ' اور جہاں سے کھانا مل سکے خرید کر کھا لے۔ اس شرط کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے کہ مسافروں کے لیے مختلف مقامات پر مسافر خانے بنوائے جا سکیں' وہاں ان کے لیے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام کیا جا سکے' جس کے پاس بستر نہ ہو اس کو بستر دیا جا سکے اور جو بیمار ہو اس کو طبی امداد بہم پہنچائی جا سکے۔

(۶) زکوٰۃ کے مستحقین میں یتیم بچے بھی شامل ہیں جن میں بکثرت ایسے چھوٹے بچے بھی ہو سکتے ہیں جو خود اپنی کوئی ضرورت بھی پوری کرنے پر قادر نہ ہوں۔ خصوصاً قحط' وبا' سیلاب' جنگ وغیرہ کی صورت میں ہزارہا صغیر السن بچوں کی کفالت حکومت کے ذمے آ پڑے گی۔ تملیک کی شرط کے ساتھ ان بچوں پر زکوٰۃ کا ایک پیسہ بھی صرف نہیں کیا جا سکتا۔ ان بچوں کی کفالت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ ایسی پرورش گاہوں میں رہیں جہاں ان کی نگہداشت' ان کی غذا' اُن کے لباس' ان کے علاج' اُن کی تعلیم و تربیت وغیرہ کا سارا انتظام حکومت کی طرف سے ہو۔ لیکن تملیک کی شرط کے ساتھ نہ کوئی پرورش گاہ تعمیر کی جا سکتی ہے' نہ اس کے عملے کی تنخواہیں دی جا سکتی ہیں اور نہ بچوں کی ضروریات کے لیے کسی قسم کا سامان خریدا جا سکتا ہے۔ تملیک کی شرط کہتی ہے کہ ہر بچے کو زکوٰۃ کا روپیہ دے کر اُس کا مالک بنا دو۔ پھر یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ اپنی ضروریات جس طرح چاہے پوری کر لے۔ یعنی سال بھر کا بچہ جو کسی قحط زدہ علاقے میں سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا اُسے روپے دے دیے جائیں کہ کسی آتی جاتی لاری میں بیٹھ کر شہر چلا جا اور اپنے لیے کوئی اتا ڈھونڈ کر نوکر رکھ لے۔ ماہوار وظیفہ بیت المال تجھے دیتا رہے گا۔

(۷) زکوٰۃ کے مستحقین میں وہ بیمار اور معذور لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے علاج اور اپنی کفالت کے ذرائع نہ رکھتے ہوں۔ تملیک کی شرط کے ساتھ زکوٰۃ کی مد سے صرف انہی بیماروں اور معذوروں کی مدد کی جاسکتی ہے جو روپیہ لے کر خود اپنے علاج یا اپنی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کر سکتے ہوں' یا جن کے اقارب یا ہمدردان میں کوئی ایسا ہو جو روپیہ مل جانے کی صورت میں اُن کے لیے یہ انتظام کر سکے۔ جس بیمار یا اپاہج کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو اور جس کے لیے خود دوڑ دھوپ کرنا بھی مشکل ہو' وہ زکوٰۃ کا روپیہ لے کر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایسے بے کس مریض کے لیے تو ناگزیر ہے کہ کوئی اسے اٹھا کر ایمبولینس کار پر ہسپتال لے جائے اور وہاں اُس کے لیے دوا' علاج' غذا' لباس اور تیمارداری کا پورا انتظام کیا جائے۔ اسی طرح ایسے بے کس اپاہج کے لیے محتاج خانے کی ضرورت ہے جہاں اس کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کا انتظام ہو۔ مگر تملیک کی شرط ان میں سے کوئی انتظام بھی زکوٰۃ کی مد سے نہ کرنے دے گی۔ نہ کوئی ایمبولینس کار اس شرط کے ساتھ استعمال ہو سکتی ہے' نہ معالجوں اور تیمارداروں کا کوئی عملہ رکھا جاسکتا ہے۔ نہ کوئی محتاج خانہ قائم کیا جاسکتا ہے' اور نہ خوراک' لباس اور دوائیں خرید کر مہیا کی جاسکتی ہیں۔ آپ کی اس شرط کا تقاضا یہ ہے ہر ایسے مریض یا معذور کو زکوٰۃ دے کر اس کا مالک بنا دیا جائے اور پھر وہ ان میں سے ہر چیز کے مصارف خود اس رقم میں سے دیتا رہے۔

اس طرح کے اور بہت سے عملی سوالات ہیں جو اجتماعی تنظیم کے ساتھ زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے کی صورت میں تملیک کی شرط پر اصرار کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے صرف چند سوالات پیش کیے ہیں تاکہ علماء ان پر غور کر کے یا تو ہمیں یہ بتائیں کہ تملیک کی شرط برقرار رکھتے ہوئے ان مسائل کا کیا حل ہے' یا پھر آئے دن فقہ حنفی کے نام سے اس قسم کے فتوے شائع کر کے خواہ مخواہ لوگوں کے دلوں میں شریعت کے متعلق بدگمانیاں پیدا نہ فرمایا کریں اور نہ کام کرنے والوں کے راستے میں بلاوجہ رکاوٹ ڈالیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جب زکوٰۃ کی اجتماعی تنظیم خود حکومت کر رہی تھی' زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک قطعاً شرط نہ تھی۔ اس کے شرط ہونے کا اس زمانے میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ شرط فقہاء نے بعد کے زمانے میں عائد کی ہے جبکہ اجتماعی تنظیم ختم ہو چکی تھی اور لوگ اپنی اپنی زکوٰۃ بطور خود نکال کر خرچ کرنے لگے تھے۔ اُس وقت یہ شرط عائد کرنا بلاشبہ ضروری تھا' کیونکہ اس کے بغیر یہ اندیشہ تھا کہ زکوٰۃ کا بڑا حصہ غلط مصارف میں صرف ہو

جائے گا' یا غیر مستحق لوگوں کو پہنچنے لگے گا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اجتماعی تنظیم کی شکل میں بھی بے جا مصرف کے بہت سے خطرات ہیں' مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ تملیک کی شرط پر اصرار کر کے زکوٰۃ کی اجتماعی تحصیل و تقسیم ہی کو سرے سے ناممکن بنا دیں۔ بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ جہاں کوئی بے جا صرف ہو رہا ہو اس کی نشاندہی کیجیے اور دلیل و ثبوت کے ساتھ تنقید کر کے اس کی اصلاح کے لیے کوشش فرمائیے۔

❁ ❁ ❁

تیسری تحریر:

زکوٰۃ اور مسئلۂ تملیک

سید ابوالاعلیٰ مودودی

(ترجمان القرآن' ربیع الاول ۱۳۷۴ھ / دسمبر ۱۹۵۴ء)

[جناب خان محمد صاحب ربانی (ملتان) کا ایک مضمون ''علماء کرام سے چند سوالات'' کے زیر عنوان محرم ۱۳۷۴ھ کے ''ترجمان'' میں (نیز ''تسنیم'' میں) شائع ہوا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ابھی تک ان سوالات کا کسی جانب سے جواب نہیں دیا گیا۔ جیل کے ذمہ داران کی وساطت سے یہ سوالات مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تک پہنچا کر ان سے بھی اس بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ مولانا محترم نے ان سوالات سے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی ہے' جو سنہر ہونے کے بعد جیل سے باہر آئی ہے۔ ہم اسے بھی ''ترجمان'' میں شائع کر رہے ہیں' تاکہ مسئلۂ ''تملیک'' کے سارے پہلو سامنے آ جائیں اور جو صاحب علم بھی ربانی صاحب کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دینا چاہیں وہ جواب دیتے وقت ان تنقیحات کو بھی پیش نظر رکھیں جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی ہیں۔]

زکوٰۃ کے متعلق جناب خان محمد صاحب ربانی کے سوالات میرے علم میں لائے گئے ہیں اور مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ اس معاملے میں میری تحقیق کیا ہے۔ مختصراً میں اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔

جس فتوے پر یہ سوالات کیے گئے ہیں میرے نزدیک وہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ

لِلْفُقَرَآءِ ..... الخ کی اُس تاویل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے جو حنفیہ نے اختیار فرمائی ہے۔ اس مطلب کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ..... الخ﴾ (التوبۃ: ٦٠)

''صدقات تو فقراء کے لیے ہیں اور مساکین کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو اُن پر کام کرنے والے ہوں اور اُن کے لیے جن کی تالیفِ قلب مقصود ہو..... الخ۔''

دیکھئے یہاں ''لام'' کا عمل صرف فقراء ہی پر نہیں ہو رہا ہے' بلکہ مساکین' عاملین علیہا اور مؤلفۃ قلوبہم پر بھی ہو رہا ہے۔ یہ لام تملیک کے لیے ہے تو' اور استحقاق یا اختصاص یا کسی اور معنی کے لیے ہے تو' بہرصورت جس معنی میں بھی وہ فقراء سے متعلق ہو گا اُسی معنی میں باقی تینوں سے بھی متعلق ہو گا۔ اب اگر حنفی تاویل کے لحاظ سے وہ تملیک کا مقتضی ہے تو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کا مال ان چاروں میں سے جس کے حوالے بھی کر دیا جائے گا تملیک کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ آگے تملیک در تملیک کا حکم کہاں سے نکالا جاتا ہے؟ کیا فقیر یا مسکین کی مِلک میں زکوٰۃ کا مال پہنچ جانے کے بعد اس کے تصرفات پر کوئی پابندی ہے؟ اگر نہیں تو عاملین علیہا کے ہاتھ میں مال پہنچ جانے کے بعد' جبکہ لامِ تملیک کا تقاضا پورا ہو چکا' پھر مزید تملیک کی پابندی لگانے کے لیے کیا دلیل ہے؟

لام کو اگر تملیک ہی کے معنی میں لیا جائے تو ایک شخص جب زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے اموال عاملین علیہا کے سپرد کر دیتا ہے تو گویا وہ انہیں اُس کا مالک بنا دیتا ہے' اور یہ اُسی طرح اُن کی مِلک بن جاتے ہیں جس طرح فَے اور غنیمت کے اموال حکومت کی مِلک بنتے ہیں' پھر اُن پر یہ لازم نہیں رہتا کہ وہ اُن اموال کو آگے جن مستحقین پر بھی صرف کریں بصورتِ تملیک ہی کریں' بلکہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ باقی ماندہ سات مصارفِ زکوٰۃ میں اس کو جس طرح مناسب اور ضروری سمجھیں صرف کریں۔ لامِ تملیک کے زور سے اُن پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ جو قید لگائی جا سکتی ہے وہ صرف یہ کہ جو شخص بھی زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کے سلسلے میں کوئی عمل کرے وہ بس اس عمل کی اُجرت لے لے' باقی مال اُسے دوسرے مستحقینِ زکوٰۃ پر صرف کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ لوگ عاملین علیہا ہونے کی حیثیت سے ان اموال کے مالک بنائے جاتے ہیں نہ کہ بجائے خود مستحق ہونے کی حیثیت سے۔ ''عاملین علیہا'' کا لفظ خود اُس

وجہ کو ظاہر کرتا ہے جس کے لیے زکوٰۃ ان کے حوالے کی جاتی ہے' اور پھر یہی لفظ یہ بھی طے کر دیتا ہے کہ وہ عامل ہونے کی حیثیت سے اس مال کا کتنا حصہ جائز طور پر اپنے ذاتی تصرف میں لانے کا حق رکھتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد اُس حدیث پر نگاہ ڈالیے جو امام احمد نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کی ہے۔ اس میں حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: اِذَا اَدَّیْتُ الزَّکَاۃَ اِلٰی رَسُوْلِكَ فَقَدْ بَرِئْتُ مِنْهَا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ؟ ''جب میں نے آپ کے بھیجے ہوئے عامل کو زکوٰۃ ادا کر دی تو میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنے فرض سے بریٔ الذمہ ہو گیا نا؟'' حضور ﷺ نے جواب دیا: ((نَعَمْ اِذَا اَدَّیْتَهَا اِلٰی رَسُوْلِیْ فَقَدْ بَرِئْتَ مِنْهَا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَلَكَ اَجْرُهَا وَاِثْمُهَا عَلٰی مَنْ بَدَّلَهَا)) ''ہاں! جب تو نے اسے میرے فرستادہ عامل کے حوالہ کر دیا تو تُو اللہ اور اس کے رسول کے آگے اپنے فرض سے بریٔ الذمہ ہو گیا۔ اس کا اجر تیرے لیے ہے اور جو اُس میں ناجائز تصرف کرے اس کا گناہ اسی پر ہے''۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنی زکوٰۃ عاملین علیہا کے سپرد کر کے بریٔ الذمہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر لامِ تملیک کا تقاضا جس طرح کسی فقیر یا مسکین کو زکوٰۃ دینے سے پورا ہوتا ہے اسی طرح عاملین علیہا کو دے دینے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اب یہ فتویٰ کس بنیاد پر دیا جاتا ہے کہ عاملین علیہا اگر آگے تملیک ہی کے طریقے پر اموالِ زکوٰۃ کو صرف کرتے ہوں تو اُنہیں زکوٰۃ دو ورنہ نہیں؟ زکوٰۃ دینے والوں پر یہ دیکھنا کس نے فرض کیا ہے کہ عاملین کس طریقے پر عمل کرتے ہیں؟ اُن کا فرض صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مستحقین کو یا اُن کے لیے کام کرنے والے عاملین کو اپنے اموالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دیں۔ عاملین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جس شخصیت کو اس حیثیت سے زکوٰۃ دی جا رہی ہو اُس کے بارے میں زکوٰۃ دینے والا یہ اطمینان کر لے کہ وہ واقعی ''عامل'' ہے یا نہیں۔ حکومت اسلامی موجود ہو اور اس نے عاملین زکوٰۃ مقرر کیے ہوں تو اُن کے پاس حکومت کی طرف سے تحصیل زکوٰۃ کا پروانہ موجود ہونا ہی اس اطمینان کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو اور مسلمانوں کی کسی اجتماعی تنظیم نے بطورِ خود زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کا بندوبست کیا ہو تو اس کے بارے میں بس یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ وہ واقعی مستحقین زکوٰۃ پر اس مال کو صرف کرتی ہے اور ''عمل'' کے مصارف اسی حد تک لیتی ہے جنہیں جائز و معقول کہا جا سکے۔ تحقیق سے ان باتوں کا اطمینان ہو جائے تو اس کو

زکوٰۃ دینے والا یقیناً فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ کوئی شرعی دلیل مجھے ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے سے پہلے یہ بھی تحقیق کریں کہ وہ اموالِ زکوٰۃ کو بطریقِ تملیک صرف کرتے ہیں یا نہیں۔

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ''عاملین علیہا'' کے الفاظ جو قرآن میں ارشاد فرمائے گئے ہیں' اُن کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے۔ لوگ اسے صرف اُن کارندوں تک محدود سمجھتے ہیں جن کو حکومت اسلامی اس کام کے لیے مقرر کرے۔ لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں جن کا اطلاق ہر اُس شخص پر ہو سکتا ہے جو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے سلسلے میں ''عمل'' کرے۔ اس عام کو خاص کرنے والی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر حکومت اسلامی موجود نہ ہو' یا ہو مگر اس فرض سے غافل ہو اور مسلمانوں میں کوئی گروہ یہ ''عمل'' کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو' تو آخر کس دلیل سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہیں تم ''عاملین علیہا'' نہیں ہو؟ میرے نزدیک تو یہ اللہ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے کہ اُس نے عاملین حکومت کے لیے خاص کرنے کے بجائے اپنا حکم ایسے عام الفاظ میں دیا ہے جن میں یہ گنجائش پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر موجودگی' یا غافل حکمرانوں کی موجودگی میں مسلمان بطورِ خود بھی زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لیے مختلف انتظامات کر سکیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے اس عام حکم کو عام ہی رہنے دیا جائے تو غریب طلباء کی تعلیم' یتیموں کی پرورش' بوڑھوں اور معذوروں اور اپاہجوں کی نگہداشت' نادار مریضوں کے علاج اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے لیے جو ادارے قائم ہوں' اُن سب کے منتظمین بالکل بجا طور پر ''عاملین علیہا'' کی تعریف میں آئیں گے' اور اُن کو زکوٰۃ لینے اور حسبِ ضرورت صرف کرنے کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور ان حیلہ بازیوں کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی جو آج کل ہمارے عربی مدرسوں کے مہتمم حضرات زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اس طرح ایسے ادارات قائم کرنے کی بھی گنجائش نکل آئے گی جو خاص طور پر تحصیل و صرفِ زکوٰۃ ہی کے لیے قائم ہوں۔ ان کے منتظمین بھی 'عاملین علیہا' قرار پائیں گے اور صرف زکوٰۃ کے معاملے میں اُن کے ہاتھ بھی تملیک کے فتوے سے باندھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

میرے نزدیک اگر قرآن کے الفاظ کی عمومیت نگاہ میں رکھی جائے تو صرف مذکورۂ بالا عاملین ہی پر اُن کا اطلاق نہیں ہوتا' بلکہ دوسرے بہت سے کارکن بھی اس تعریف میں آتے ہیں۔ مثلاً:

ایک یتیم کا ولی' ایک بیمار یا اپاہج کی خبر گیری کرنے والا' اور ایک بے کس بوڑھے کا

نگہبان بھی ''عامل'' ہے' اسے زکوٰۃ وصول کر کے ان لوگوں کی ضروریات پر خرچ کرنے کا حق ہے' اور اس میں سے معروف طریقے پر اپنے عمل کی اجرت بھی وہ چاہے تو لے سکتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں ڈاک خانے یا بینک کو اجرت دی جا سکتی ہے' کیونکہ اس خدمت کو انجام دینے کی حد تک وہ بھی ''عاملین علیہا'' ہوں گے۔

زکوٰۃ وصول کرنے' یا زکوٰۃ کے اموال ایک جگہ سے دوسری جگہ حسبِ ضرورت لے جانے' یا مستحقین زکوٰۃ کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے ریل' بس' ٹرک' ٹانگے' ٹھیلے وغیرہ جو استعمال کیے جائیں ان کے کرائے مالِ زکوٰۃ سے دیے جا سکتے ہیں' کیونکہ یہ خدمات انجام دیتے وقت یہ سب ''عاملین علیہا'' میں ہی شمار ہوں گے۔

مستحقین زکوٰۃ کی خدمت کے لیے جس قدر بھی ملازم اور مزدور استعمال کیے جائیں گے' ان سب کی تنخواہیں اور اجرتیں زکوٰۃ کی مد سے دی جا سکتی ہیں' کیونکہ وہ سب عاملین علیہا میں داخل ہیں' قطع نظر اس سے کہ کوئی ریلوے سٹیشن پر زکوٰۃ کے غلے کی بوریاں ڈھوئے' یا کوئی غریب مریضوں کی خدمت کے لیے گاڑی چلائے' یا کوئی یتیم بچوں کی نگہداشت کرے۔

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا عاملین علیہا کے تصرفات پر کوئی ایسی پابندی ہے کہ وہ مستحقین زکوٰۃ کی خدمت کے لیے عمارات نہ بنوا سکیں اور اشیائے ضرورت مثلاً گاڑیاں' دوائیں' آلات' کپڑے وغیرہ نہ خرید سکیں؟ میں کہتا ہوں کہ حنفی تاویلِ آیت کے لحاظ سے یہ پابندی صرف زکوٰۃ ادا کرنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ وہ خود بلاشبہ ان تصرفات میں سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا' اس کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی رو سے زکوٰۃ ''جن کے لیے'' ہے اُن کی یا اُن میں سے کسی کی مِلک میں دے دیں۔ رہے ''عاملین علیہا'' تو اُن پر اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ وہ تمام مستحقین زکوٰۃ کے لیے بمنزلہ ولی یا وکیل ہیں۔ اور اصل مستحق اس مال میں جتنے تصرفات کر سکتا ہے وہ سب تصرفات اس کے ولی یا وکیل ہونے کی حیثیت سے یہ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ جب فقراء و مساکین کی ضروریات کے لیے کوئی عمارت بنائیں یا کوئی گاڑی خریدیں' تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بہت سے فقیروں اور مسکینوں نے' جن کو فرداً فرداً زکوٰۃ ملی تھی' باہم مل کر ایک عمارت بنوالی' یا ایک سواری خرید لی۔ جس طرح ان کے اس تصرف پر کوئی پابندی نہیں ہے اس طرح ان کے وکیل یا ولی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے مقرر کیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اسی لیے ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے والے کو فرض سے سبکدوش

قرار دیا ہے کہ انہیں یہ مال دے دینا گویا تمام مستحقین کو دے دینا ہے۔ وہ انہی کی طرف سے اسے وصول کرتے ہیں اور انہی کے نائب و سرپرست بن کر اُسے صرف کرتے ہیں۔ آپ اُن کے تصرفات پر اس حیثیت سے ضرور اعتراض کر سکتے ہیں کہ تم نے فلاں خرچ بلاضرورت کیا' یا فلاں چیز پر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا' یا اپنے عمل کی اجرت معقول حد سے زیادہ لے لی' یا کسی عامل کو معقول شرح سے زیادہ اجرت دے دی۔ لیکن کوئی قاعدۂ شرعی میرے علم میں ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنا پر اُن کو اس بات کا پابند کیا جا سکے کہ فلاں فلاں قسم کے تصرفات تم کر سکتے ہو اور فلاں قسم کے نہیں کر سکتے۔ قواعدِ شریعت انہیں ہر اُس کام کی اجازت دیتے ہیں جس کی مستحقین زکوٰۃ کے لیے ضرورت ہو۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل حل طلب سوالات صرف دو ہیں:

ایک یہ کہ اگر زکوٰۃ دینے والوں اور زکوٰۃ کا استحقاق رکھنے والوں کی رضامندی سے چند غیر سرکاری آدمی زکوٰۃ پر کام کریں تو آیا وہ قرآن کے ارشاد کے مطابق عاملین علیہا کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں؟

دوسرے یہ کہ عاملین علیہا کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے کے بعد اُن کے تصرفات پر پھر تملیک کی قید عائد کرنے کے لیے کیا دلیل ہے؟ علماء کرام کو انہی دو سوالات پر غور کر کے کوئی فیصلہ دینا چاہیے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی)

❁ ❁ ❁

<u>چوتھی تحریر:</u>

احکامِ زکوٰۃ

(ترجمان القرآن' جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ/فروری ۱۹۵۵ء)

[''ترجمان'' محرم ۷۴ھ میں خان محمد صاحب ربانی کی طرف سے زکوٰۃ کے بارے میں چند سوالات شائع کیے گئے تھے۔ ربیع الاول کے پرچے میں اس سے متعلق مولانا مودودی کی رائے پیش کی گئی تھی۔ اب جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی نے ان دونوں پرچوں کو ملاحظہ فرما کر اس بارے میں اپنی تحقیق علی الترتیب اپنے دو عنایت ناموں میں مدیر ''ترجمان'' کے نام ارسال فرمائی ہے۔ ہم بڑی خوشی اور شکریے کے ساتھ ان دونوں گرامی ناموں کو ترجمان میں نقل کر رہے ہیں۔]

مکتوب اوّل

بعد الحمد والصلوٰۃ بعض احباب نے ترجمان القرآن' بابت محرم ۱۳۷۴ھ کی طرف مجھے توجہ دلائی جس میں ایک مقالہ حضرات علماء کی خدمت میں چند سوالات کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہ حنفی میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک کی جو شرط لگائی گئی ہے وہ صرف ایسی صورت میں قابل عمل ہے جبکہ لوگ انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ نکال کر انفرادی طور پر ہی اس کو صرف کر دیں' لیکن اگر اجتماعی طور پر مثلاً اسلامی حکومت کے ذریعہ سے اس کو وصول اور صرف کرنے کا انتظام کیا جائے تو یہ شرط اپنے جزئی احکام کے ساتھ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ پھر سوال کی توضیح کے لیے چند عملی مشکلات پیش کر کے علماء سے ان کا حل دریافت کیا گیا۔ جواباً عرض ہے کہ تملیکِ فقیر زکوٰۃ کے لیے شرط ہی نہیں بلکہ رکن ہے' بلکہ زکوٰۃ کی حقیقت ہی تملیکِ فقیر ہے جیسا فقہاء کی عبارات سے آئندہ واضح ہو جائے گا۔ اور جس زمانے میں زکوٰۃ اسلامی حکومت کے ذریعہ وصول کی جاتی تھی تو اس کی یہ صورت نہ تھی کہ عامل تنہا ہر شخص کے مکان یا چراگاہ پر جاتا اور زکوٰۃ وصول کرتا ہو' بلکہ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا۔ وہی اس مقام کے تھانہ یا تحصیل میں زکوٰۃ کے مویشی اور اموال جمع کرتے تھے اور اس بستی کے غرباء ایسی جگہ جمع ہو جاتے اور ان پر زکوٰۃ تقسیم کر دی جاتی تھی۔ جب تک اس مقام پر فقراء موجود ہوتے دوسرے مقام پر زکوٰۃ منتقل نہ ہوتی تھی۔ پھر چونکہ ولایتِ عامہ کی وجہ سے امام فقراء کا وکیل ہوتا اور عمال امام کے نائب ہوتے تھے' اگر فقراء کی مصلحت سے زکوٰۃ کو منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو امام اور اس کے عمال کو مصارفِ نقل بھی مالِ زکوٰۃ سے وصول کرنے کا حق تھا' جیسا خود فقیر مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کر کے اپنے گھر لے جاتا تو مصارفِ نقل اُسی مال سے نکال سکتا تھا۔ غالباً سائل کے ذہن میں سوال کے وقت یہ نکتہ نہیں تھا کہ امام یا مصدق کا مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کرنا فقراء ہی کا قبضہ کرنا ہے' کیونکہ وہ بوجہ ولایتِ عامہ کے فقراء کا وکیل ہے' لیکن اس پر کسی ادارہ کے ناظم یا عامل کو قیاس نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ اس کو ولایتِ عامہ حاصل نہیں اس لیے وہ فقراء کا وکیل نہیں اور اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ مالِ زکوٰۃ میں سے ناظم یا عامل کا سفر خرچ یا مصارفِ نقل وصول کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ پوری ادا نہ ہوگی۔

قال فی البدائع واما رکن الزکوٰۃ؟ فرکن الزکوۃ ھو اخراج جزأ من

النصاب الی الله تعالی وتسلیم ذلك الیه بقطع المالك یدهٗ عنه بتملیكه من الفقیر وتسلیمه الیه او الی ید من هو نائب عنه وهو المصدق ..... (الی ان قال) وقد امر الله تعالی الملاك بایتاء الزكوة بقوله عزوجل وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ والایتاء هو التملیك ولذا سمی الله تعالی الزكوة صدقة بقوله عزوجل اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والتصدق تملیك (الی ان قال) وعلی هذا یخرج صرف الزكوٰة الی وجوه البر من بناء المساجد والرباطات والسقایات واصلاح القناطر وتكفین الموتٰی ودفنهم انه لا یجوز لانه لم یوجد التملیك اصلاً وكذا اذا اشتری بالزكوة طعاما فاطعم الفقراء غداءً وعشاءً (بطریق الاباحة) ولم یدفع عین الطعام الیهم لا یجوز لعدم التملیك (الی ان قال) ولو دفع زكوة الی الامام او الی عامله یجوز لانه نائب عن الفقیر فی القبض فكان قبضه كقبض الفقراء (بدائع الصنائع' ج ۲' ص ۳۹)

''زکوٰۃ کا رکن یہ ہے کہ مالِ نصاب کا ایک حصہ خدا کے لیے نکالا جائے اور اسی کے حوالے کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فقیر کو زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے اور زکوٰۃ اس کے یا اس کے کسی نائب (یعنی مصدّق) کے سپرد کر کے زکوٰۃ دینے والا اس سے قطعی طور پر دست بردار ہو جائے..... اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ دینے کا مالکوں کو حکم دیا ہے۔ بقولہ عزوجل وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور ''ایتاء'' تملیک ہی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صدقہ کا نام بھی دیا ہے' بقولہ عزوجل اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور ''تصدّق'' تملیک ہے۔ چنانچہ نیکی کے کاموں' مثلاً مساجد' سرائے' سبیل اور پلوں کی تعمیر و مرمت اور میت کی تکفین و تدفین پر زکوٰۃ جائز نہیں' کیونکہ ان میں تملیک اصلاً نہیں پائی جاتی۔ اس طرح اگر زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ سے کھانا خرید لے اور صبح شام اپنی مرضی اور صوابدید سے فقیروں کو کھلائے اور کھانا بجنسہٖ اُن کے سپرد نہ کرے' تو عدم تملیک کی بنا پر ایسا کرنا جائز نہ ہوگا..... اگر زکوٰۃ حاکم یا اُس کے عامل کے سپرد کر دی جائے تو جائز ہے' کیونکہ عامل زکوٰۃ وصول کرنے میں فقیر کا نائب اور نمائندہ ہے۔ اس کا زکوٰۃ لینا فقیر کے زکوٰۃ لینے کی مانند ہے۔''

زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا متفق علیہ ہے' کسی امام کا اس میں اختلاف بیان نہیں کیا گیا' بلکہ امام شافعیؒ کی طرف تو یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں ''لام'' ملک کے لیے ہے۔

قال واما النص فقوله تعالى اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وقوله عزوجل وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ والاضافة بحرف اللام تقتضى الاختصاص بجهة الملك اذا كان المضاف اليه من اهل الملك..... واما الحقيقة فان الزكوٰة تمليك المال من الفقير والمنتفع بها هو الفقير فكانت حق الفقير(بدائع' ج۲' ص ٤'٥) ودليل عدم نقل الزكوٰة حديث معاذ فان هم اطاعوا لك فى ذالك فاخبرهم ان عليهم صدقة فى اموالهم توخذ من اغنيائهم وترد على فقرائِهِمْ (متفق عليه) وروى ابوعبيد فى الاموال كما فى كنز العمال عن عمرو بن سعد ان معاذ بن جبل لم يزل بالجند اذ بعثه رسول الله ﷺ وابوبكرؓ ثم قدم على عمرؓ فرده على ما كان عليه فبعث معاذ (۱) بثلث صدقة الناس فانكر عليه عمر فقال لم ابعثك جابيا ولا آخذ جزية ولكن بعثتك تأخذ من اغنياء الناس فترده فى فقرائهم قال معاذ ما بعثت اليك بشىء وانا اجد احدا ياخذه منى فلما كان العام الثانى بعث اليه شطر الصدقة فتراجعا مثل ذلك فلما كان العام الثالث بعث اليه بها كلها فراجعه عمر بمثل ما راجعه قبل فقال معاذ ما وجدت احدا ياخذ منى شيئا(بدائع' ج۳' ص ۳۰٤ و فى البدائع' ج۲' ص ۷۵) واما زكوٰة المال فحيث المال فى الروايات كلها

---

(۱) قلت والظاهر من قوله بعث معاذ بثلث الصدقة وبشطرها وبكلها انه لم يأخذ منها مؤنة النقل واجرتها بل كان يبعثها مع بريد الحكومة من غير ان ينقص من مال الزكوٰة شىء۔

(ترجمہ) اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صدقہ (تہائی' آدھا یا سارا) نقل وحرکت کی اجرت وضع کیے بغیر اور تنخواہ لیے بغیر بھیج دیا' بلکہ حکومت کی ڈاک کے ہمراہ بھیج دیا ہوگا اور زکوٰۃ میں کچھ کمی نہ ہوئی ہوگی۔

ویکرہ اخراجھا الی غیر اھل ذلك الموضع الا روایۃ عن ابی حنیفۃؒ انہ لا بأس ان یخرجھا الی قرابۃ من اھل الحاجۃ ویبعثھا الیھم(۱)

''اس بارے میں نص یہ ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ..... اور وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ لِلْفُقَرَاءِ اور لِلسَّآئِلِ میں فقراء اور سائل کی طرف حرفِ لام کی اضافت اور تعلق اس بات کا مقتضی ہے کہ یہاں اختصاص باعتبارِ ملک مراد لیا جائے بشرطیکہ فقیر اور سائل اہل ملک میں سے ہوں..... حقیقت میں زکوٰۃ یہ ہے کہ مال پر فقیر کی تملیک ہو جائے۔ فقیر ہی اس سے فائدہ اٹھانے والا ہے اور اسی کا یہ حق ہے۔ (بدائع' ج ۲' ص ٤'٥) اور زکوٰۃ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کیے جانے کی دلیل وہ متفق علیہ حدیث ہے جس میں حضرت معاذؓ سے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگ تمہاری اطاعت قبول کر لیں تو انہیں آگاہ کر کہ ان کے مالوں پر زکوٰۃ ہے جو اُن کے اغنیاء سے لی جائے گی اور اُن کے فقراء پر لوٹا دی جائے گی۔ اور کتاب الاموال لابی عبید اور کنز العمال میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا اور وہ وہیں رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں وہ آئے مگر انہیں اپنے منصب پر واپس بھیج دیا گیا' بعد میں حضرت معاذؓ نے لوگوں کی ایک تہائی زکوٰۃ بھجوائی۔ حضرت عمرؓ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تمہیں ٹیکس اور جزیہ لینے کے لیے نہیں بھیجا تھا' میں نے تجھے اس لیے بھیجا تھا کہ تو اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر فقراء میں اسے واپس کر دے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے اس کا کوئی لینے والا نہیں ملا اس لیے اسے آپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ دوسرے سال آدھی زکوٰۃ بھیجی' اور یہی سوال و جواب ہوا' تیسرے سال انہوں نے پوری زکوٰۃ بھیجی' پھر وہی گفتگو ہوئی اور حضرت معاذؓ نے پھر یہی کہا کہ مجھے زکوٰۃ لینے والا نہیں مل سکا۔ اور مال کی زکوٰۃ وہیں نکالی جائے جہاں مال ہے۔ تمام روایات میں

(۱) قلت ھذا فی زکوٰۃ الاموال الباطنۃ التی لا یطالبھا الامام واما الاموال الظاھرۃ فحکمھا ما قالہ عمرؓ الا تنقل الی غیر ذلك الموضع الا اذا لم یکن ھناك من یاخذھا واللہ اعلم۔

(ترجمہ) یہ اجازت اموالِ باطنہ کے بارے میں ہے جن کا حاکم مطالبہ نہیں کرتا' لیکن اموالِ ظاہرہ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے قول پر عمل ہوگا۔ یعنی انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جائے گا' الا یہ کہ اصل جگہ مستحق موجود نہ ہو۔

دونوں مذکورہ بالا حواشی مولانا عثمانی کی طرف سے ایزاد کیے گئے ہیں۔ (ترجمان)

یہی ہے۔ دوسری جگہ کے لوگوں کی طرف زکوٰۃ کا نکال کر لے جانا مکروہ ہے' سوائے امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے جس کے بموجب دوسری جگہ حاجت مند عزیزوں کو زکوٰۃ پہنچانے میں مضائقہ نہیں ہے۔''

میرے خیال میں سوال کا جواب اور اشکالات کا حل ہو چکا ہے۔ اب تکمیل کے طور پر چند ضروری مسائل بیان کیے جاتے ہیں تاکہ اگر کسی وقت حکومت پاکستان باقاعدہ بیت المال قائم کرے اور زکوٰۃ کے وصول و تقسیم کا انتظام کرنا چاہے تو ان مسائل کی رعایت کی جائے۔

مقدمۂ اولیٰ

بیت المال میں چار قسم کے اموال الگ الگ رکھے جائیں گے۔

(ا) مویشیوں کی زکوٰۃ' عشری زمینوں کا عشر' مسلمان تاجروں سے جو کچھ عاشر وصول کرے جب کہ وہ تجارتی مال لے کر اُس کی حدود سے گزریں اور یہ تجارتی مال کی زکوٰۃ ہوگی جو سال میں ایک دفعہ چالیسواں حصہ کے حساب سے وصول کی جائے گی۔ اس کے مصرف فقراء و مساکین' اور زکوٰۃ کے عاملین اور نومسلم فقراء' اور قرض دار' جن کا موجودہ سرمایہ اداءِ قرض کے لیے کافی نہیں ہے اور وہ مجاہد جن کے پاس میدانِ جہاد میں کافی سامان نہیں اور مسافر جن کے پاس بحالتِ سفر گھر تک پہنچنے کا خرچ نہ رہا ہو اور وہ غلام ہیں جن کے مالکوں نے خاص مقدار میں رقم مقرر کر دی ہو کہ اس کو ادا کر دینے پر آزاد ہو جائیں گے جن کو شریعت میں مکاتب کہا جاتا ہے۔ یہ قسم آج کل یہاں موجود نہیں' ممکن ہے جہاد کی نوبت آنے پر ان کا وجود ہو جائے۔

(ب) مالِ غنیمت کا خمس اور کانوں اور دفینوں کا خُمس۔ کانوں کا خُمس اُس وقت لیا جائے گا جب کہ حاکمِ اسلام کسی کو اُن کے کھودنے اور نکالنے کی اجازت دے دے۔ اگر حکومت خود اپنے اہتمام سے کانیں کھودنے اور نکالنے کا بندوبست کرے تو جو کچھ نکلے گا سب حکومت اسلام کا ہوگا۔ البتہ اگر کسی کو اتفاقی طور پر کسی پہاڑ سے کچھ سونا وغیرہ مل گیا تو اس سے بھی خُمس لیا جائے گا اور بیت المال میں جمع ہوگا' جیسا کسی کو اسی طرح دفینہ مل جائے اور اس کی تفصیل فقہاء کے کلام سے معلوم کی جائے۔ اس کا مصرف یتامیٰ اور مساکین اور مسافرین ہیں۔ اور جو بچے وہ حکومت کی ضروریات اور اسلحہ وغیرہ میں صرف کیا جائے گا۔

(ج) خراجی زمینوں کا لگان' اہل ذمہ کا انکم ٹیکس (جس کو جزیہ کہا جاتا ہے) یا کسی مقام کے باشندوں سے کسی خاص مقدار پر صلح کی گئی ہو تو صلح کی رقوم اور جو کچھ عاشر تجار اہل ذمہ

اور مستأمنین دار الحرب سے وصول کرے جبکہ وہ اس کی حدود سے تجارتی مال لے کر گزریں۔ اس قسم کا مصرف مصالح مسلمین ہیں جیسے حاکموں' قاضیوں' مفتیوں اور سپاہیوں' فوجیوں کی تنخواہیں' راستوں کی حفاظت' مسجدوں' سرایوں' مسافر خانوں کی عمارت' چھوٹے بڑے پلوں کی مرمت یا تعمیر' سرحدوں کا استحکام اور ایسی نہروں کا انتظام جو کسی کی ملکیت نہیں بلکہ حکومت ہی کی ملکیت ہیں۔

(۵) لاوارث مُردوں کا ترکہ یا ایسے لوگوں کا ترکہ جو اپنے پیچھے صرف بیوی چھوڑ گئے ہیں یا عورت صرف شوہر چھوڑ گئی ہے اُن کا حصہ دے کر باقی بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ اسی طرح گری پڑی چیزوں کی کافی تشہیر کے بعد بھی مالکوں کا پتا نہ لگا ہو تو وہ بھی بیت المال میں داخل کی جائیں گی۔ اس قسم کا مصرف بیمار غریبوں کی دوا علاج معالجہ اور غریب مُردوں کا کفن دفن جبکہ وہ کچھ چھوڑ کر نہ مرے ہوں' ایسے بچوں کی پرورش جو کسی جگہ پڑے ہوئے پائے جائیں' ایسے نادار لوگوں کی امداد جو کمانے اور محنت کرنے سے عاجز ہو گئے ہوں اور اُن کا کوئی عزیز قریب بھی ایسا نہیں جس کے ذمہ شرعاً ان کا نفقہ واجب ہو۔ امام پر لازم ہے ان جملہ اقسام کی رقوم کو اُن کے مستحقوں تک پہنچائے' ورنہ عند اللہ ماخوذ ہوگا۔ غالباً اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ باقاعدہ بیت المال قائم ہونے کی صورت میں وہ مشکلیں پیش نہیں آ سکتیں جو ترجمان القرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ کیونکہ سب کاموں کے لیے صرف زکوٰۃ اور صدقۂ فطر ہی نہیں بلکہ دوسرے اموال بھی ہیں جن میں تملیکِ فقیر ضروری نہیں' بلکہ مناسب صورت سے ان کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس نکتہ پر بھی تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ قسم اوّل و دوم کے سوا بقیہ اقسام کے اموال مسلمانوں اور ذمیوں دونوں پر حسب ضرورت تقسیم ہو سکتے ہیں۔ چونکہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے لی جاتی ہے وہ مسلمانوں ہی پر صرف ہو گی اور جہاد بھی صرف مسلمانوں پر فرض ہے۔ اس کی غنیمت کا خُمس بھی مسلمانوں پر صرف ہوگا۔ بقیہ اقسام کی تقسیم مسلم و غیر مسلم دونوں پر ہو سکتی ہے۔

مقدمۂ ثانیہ

حکومت کا اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے مطالبہ کا حق نہیں (**اِلّا بضرورۃ شدیدۃ**) بلکہ وہ صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کی حق دار ہے' جیسے مویشیوں کی زکوٰۃ جو سال کے زیادہ حصہ میں گھر پر نہیں بلکہ جنگل میں چرتے ہوں اور ان تاجروں کے تجارتی مال کی زکوٰۃ جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں مال لے جاتے ہوں اور باہر سے مال منگاتے ہوں' نیز عشری و

خراجی زمینوں کا عشر وخراج بھی اموالِ ظاہرہ سے ہیں۔ اور جو تاجر اپنے شہر ہی میں تجارت کرتا ہے' نہ باہر سے مال منگاتا ہے نہ بھیجتا ہے' اس کا تجارتی مال اموالِ باطنہ میں داخل ہے۔ اسی طرح جو نقد اور زیور کسی کے گھر میں ہے وہ بھی اموالِ باطنہ سے ہے' البتہ جو روپیہ بینک میں یا لمیٹڈ کمپنیوں میں ہے اس کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

مقدمۂ ثالثہ

حکومت کو اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق اُسی وقت ہے جبکہ وہ ڈاکوؤں چوروں سے ان اموال کی حفاظت کا انتظام کرتی ہو۔ اگر بدنظمی اور تعطل حدود کی وجہ سے لوگوں کے اموال محفوظ نہ ہوں تو حکومت کو مطالبۂ زکوٰۃ کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر امام اور اس کے عمال نماز کے پابند نہ ہوں تب بھی بعض علماء کے نزدیک حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں۔

مقدمۂ رابعہ

حکومت کو صدقۂ فطر اور چرمِ قربانی اور دیگر صدقات کے مطالبہ کا حق نہیں۔ (الّا بضرورۃ شدیدۃ)

مقدمۂ خامسہ

اگر حکومت زکوٰۃ وعشر کو اس کے مصارفِ شرعیہ میں خرچ نہ کرتی ہو تو مال داروں کے ذمہ سے عشر اور زکوٰۃ ادا ہو گی یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں ادا ہو جائے گی اور جا و بے جا صرف کرنے کا وبال حکام پر ہو گا۔ بعض کہتے ہیں کہ خراج تو ادا ہو جائے گا مگر زکوٰۃ وعشر ادا نہ ہو گا' مال داروں کو دوبارہ بطورِ خود اُن کا ادا کرنا واجب ہو گا۔

مقدمۂ سادسہ

جن اموال کی زکوٰۃ کے مطالبہ کا حکومت کو حق حاصل ہے اگر کوئی ان کی زکوٰۃ بھی خود ہی ادا کر دے تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور امام شافعیؒ کے نزدیک حکومت کو اس سے دوبارہ مطالبہ کا حق نہیں' مگر حنفیہ کے نزدیک حکومت کو مطالبہ کا حق ہو گا۔ اموالِ ظاہرہ میں وہ صاحبِ مال کی اس بات کو رد کر سکتی ہے کہ اس نے خود زکوٰۃ ادا کر دی ہے' ہاں اگر وہ یہ کہے کہ میں نے دوسرے مصدق کو زکوٰۃ دے دی ہے' یا کوئی تاجر مال لے کر عاشر کے سامنے سے گزرے اور یہ دعویٰ کرے کہ اس سے دوسرے عاشر نے زکوٰۃ وصول کر لی ہے

تو مصدّق یا عاشر کی رسید دکھلانے پر اس کی تصدیق کی جائے گی' کیونکہ اس صورت میں اس نے حکومت کے حق کو باطل نہیں کیا ہے۔

مقدمۂ سابعہ

مطالبۂ زکوٰۃ وعشر کا حق اسی حکومتِ مسلمہ کو ہے جو آئین اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو۔ ہر حکومت کو یہ حق حاصل نہیں جو کہ برائے نام ہی اسلامی حکومت ہو اور واقع میں اسلامی حکومت نہ ہو۔

[مولانا محترم نے ان مقدماتِ سبعہ کے بیان کے بعد ان میں سے ہر ایک کی تائید میں کتب فقہیہ کی مفصل عبارات نقل فرمائی ہیں۔ ان عبارتوں کا یہاں دینا بہت موجب طوالت ہوگا' خصوصاً جب کہ اُن کے ترجمے بھی کیے جائیں۔ اس لیے ہم مولانا مدظلہ سے معذرت کے ساتھ پہلی چھ عبارتیں حذف کر رہے ہیں' البتہ ہم ان چھ کے حوالے کتب وصفحات کی تصریح کے ساتھ بالترتیب تحریر کیے دیتے ہیں' تاکہ ذی علم اصحاب اگر مراجعت کرنا چاہیں تو کرسکیں۔ حوالے یہ ہیں: بدائع الصنائع' ج ۲' ص ۶۹' ص ۳۰' ص ۳۶۔ التخیص الحبیر' ج ۱' ص ۱۷۸' ردالمحتار' ج ۲' ص ۱۲۷۔ البتہ مقدمۂ سابعہ کا ترجمہ اور اس کی مزید توضیح چونکہ مولانا موصوف نے تحریر فرمائی ہے اس لیے اس مقدمے کی پوری دلیل کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ محذوف حوالہ جات ماہنامہ ''الصدیق'' (ملتان) شمارہ جمادی الاولیٰ میں بھی مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔] (ادارہ ترجمان القرآن)

ودلیل المقدمة السابعة' ما فی شرح العقائد النسفية' ص ۱۱۴

المسلمون لا بدلهم من امام يقوم بتنفيذ الاحكام واقامة الحدود وسد الثغور وتجهيز جيرتهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار والصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم ونحو ذلك من الامور التى لا يتولاها آحاد الامة الى ان قال بعد ذكر ما اورده الموردون على توقف الانتظام على وجود الامام بما نصبه ـ قلنا نعم يحصل بعض النظام فى امر الدنيا (بذى شوكة له الرياسة العامة) ولكن يختل

امر الدین وھو الامر المقصود الاھم والعمدۃ العظمی

''مسلمانوں کے لیے ایسا امام ہونا ضروری ہے جو احکامِ شرعیہ کی تنفیذ اور حدودِ شرعیہ کے اجراء اور سرحدِ اسلام کی حفاظت کا انتظام کرے' مسلمانوں کے لیے لشکر تیار کرے' اُن کی زکوٰۃ وصدقات وصول کرے' غلبہ کرنے والوں اور جاسوسوں' چوروں اور ڈاکوؤں کو مقہور ومغلوب کرے' جمعہ اور عیدین کی نمازیں قائم کرے اور لوگوں میں جو تنازعات اور جھگڑے پیدا ہوں ان کا شریعت کے موافق فیصلہ کرے اور لوگوں کے حقوق پر جو شہادتیں قائم ہوں ان کو سنے اور قبول کرے اور نابالغ لڑکے لڑکیاں جن کا کوئی ولی نہیں ہے ان کی شادی بیاہ کا انتظام کرے' مالِ غنیمت کو باقاعدہ تقسیم کرے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں جو انفرادی طریقہ سے انجام نہیں پا سکتے۔ اس کے بعد ان اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے جو نصب امام کی ضرورت پر بعض لوگوں نے وارد کیے ہیں' لکھا ہے: ہاں ایسے شخص کے ذریعے سے جو صاحب شوکت ہو اور اُسے ریاست عامہ حاصل ہو دنیا کے بعض کاموں کا تو انتظام ہو سکتا ہے مگر دین کا نظام مختل ہو جائے گا اور سب سے بڑا مقصود اسلامی سلطنت قائم کرنے سے یہی ہے۔''

یہاں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اسلام کا بڑا مقصد سلطنت قائم کرنے سے امورِ دین کا انتظام' احکامِ شرعیہ کا نفاذ' نماز اور زکوٰۃ وصدقات کا نظم اور شریعت کے موافق مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا' جہاد اور سامانِ جہاد کا بندوبست کرنا ہے۔ اگر کسی سلطنت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت ہو۔ اور زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا حق اسی سلطنت کو ہے جو اس مقصد کو پورا کرے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے' ورنہ اس کو یہ حق حاصل نہ ہوگا۔ پس جو لوگ اسلامی سلطنت میں سیاست اور مذہب کو الگ کرنا چاہتے ہیں وہ اسلامی سلطنت قائم کرنا نہیں چاہتے بلکہ یورپین طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان اسی لیے حاصل کیا گیا ہے تاکہ یہاں اسلامی سلطنت قائم کی جائے جو مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا انتظام کرے اور اقلیت کو وہ حقوق عطا کرے جو اسلامی سلطنت میں دیے جاتے ہیں جس سے زیادہ عدل وانصاف کے ساتھ تو کوئی حکومت بھی اقلیتوں کو ان کے حقوق نہیں دے سکتی۔ جو لوگ حدودِ شرعیہ کو وحشیانہ سزائیں کہتے ہیں' دراصل وہ ان اعمال کو وحشیانہ نہیں سمجھتے جن کی یہ سزائیں شریعت نے مقرر کی ہیں۔ اگر وہ ان اعمال کو وحشیانہ سمجھتے تو ہرگز ان سزاؤں کو وحشیانہ نہ کہتے' کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ ان سزاؤں کے بغیر ان وحشیانہ افعال کا

قلع قمع نہیں ہوسکتا۔ یورپ کی سلطنتیں ان وحشیانہ جرائم کا استیصال ہی کرنا نہیں چاہتیں اس لیے وہ اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ بتلاتی ہیں۔ اگر وہ ان کا استیصال کرنا چاہتیں تو ان کو ماننا پڑتا کہ اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہی ان امراض کا اصلی علاج ہے۔ واللہ اعلم!

مکتوبِ ثانی

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ربیع الاول کا ترجمان القرآن دو دن بعد ملا' اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔ میں نے مولانا مودودی کی تحریر دیکھی۔ انہوں نے والعاملین علیہا کے عموم میں ہر ادارہ کے عاملین کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں' کیونکہ آیت میں اور بھی عمومات ہیں جن کو بدلیل السنۃ عموم پر نہیں رکھا گیا۔ مثلاً ''الصدقات'' کو صدقاتِ مفروضہ پر محمول کیا گیا ہے' کیونکہ صدقاتِ نافلہ فقراء و مساکین کے ساتھ مخصوص نہیں' غنی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اسی طرح الفقراء وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْغَارِمِيْنَ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں' کفار کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ اسی طرح والعاملین علیہا سے وہی لوگ مراد ہیں جن کو حکومتِ اسلامیہ نے تحصیل و وصولِ صدقات کے لیے مقرر کیا ہو۔

قال فی البدائع واما العاملون علیها؟ فهم الذین نصبهم الامام لجباية الصدقات (الی ان قال) ان ما یستحقه العامل انما یستحقه بطریق العمالة لا بطریق الزکوة بدلیل انه یعطی وان کان غنیا بالاجماع وبدلیل انه (ای رب المال) لو حمل زکوة بنفسه الی الامام لا یستحق العامل منها شیئا انه انما یستحق بعمله لکن علی سبیل الکفایة له ولاعوانه لاعلی سبیل الاجرة لان الاجرة مجهولة ..... الخ (بدائع' ج ۲' ص ٤٤۔)

''عاملین علیہا وہ لوگ ہیں جنہیں امامِ حکومت نے صدقات وصول کرنے پر مقرر کیا ہو ..... عامل کارکن ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ کا مستحق ہوتا ہے' ورنہ وہ براہِ راست زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ وہ غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا خود زکوٰۃ امام تک لے جاتا تو عامل اس میں سے کسی شے کا مستحق نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عامل اپنے اور اپنے رفقاء کے گزراوقات کے لیے زکوٰۃ میں سے لیتا ہے' اجرت کے طور پر نہیں لیتا' کیونکہ اجرت تو معلوم و متعین ہی نہیں ہے''۔

عام طور سے کتب فقہ میں عاملین سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو امام یا سلطان نے صدقات وصول کرنے کے لیے مقرر کیا ہو۔ ان ہی کا قبضہ قائم مقام قبضۂ فقراء کے ہوسکتا ہے' کیونکہ امام کو ولایتِ عامہ حاصل ہے اور عاملین اس کے نائب ہیں۔ عام اداروں کو ولایتِ عامہ حاصل نہیں۔ اس لیے ان کو فقراءِ مجہولین کا قائم مقام نہیں کہہ سکتے' صرف زکوٰۃ دینے والوں کا نائب کہہ سکتے ہیں' کیونکہ وہ تو معلوم ہیں۔ پس ان کے قبضہ کو قبضۂ فقراء نہیں کہا جاسکتا اور ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ کی رقم پہنچنے سے زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی جب تک فقراء کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے۔ اب اگر یہ ادارے یا اُن کے عاملین زکوٰۃ میں سے سفر خرچ وغیرہ نکالیں گے' زکوٰۃ پوری ادا نہ ہوگی' ادھوری ہوگی۔ پس جو ادارے زکوٰۃ کی تحصیل ووصول کے لیے کھڑے ہوں ان کو ولایت عامہ حاصل کرنا چاہیے' جس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو یہ حق دیا جائے یا پھر عامۃ المسلمین باتفاق اُن کو یہ حق دے دیں' کیونکہ عامۃ المسلمین بھی حکومت کے قائم مقام ہو جاتے ہیں' مگر عامۃ المسلمین کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔

❁ ❁ ❁

بقیہ: مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل

حتمی اور قطعی رائے کی حیثیت سے پیش کروں یا اپنے منصب سے متجاوز ہو کر اس کو فتوے کی حیثیت دوں' بالخصوص جبکہ اس کا تعلق ایک ایسے مسئلہ سے ہے جس میں بعض قابل اعتماد لوگوں نے اس سے مختلف رائے قائم کی ہے جو میں نے قائم کی ہے۔ تاہم چونکہ میں اپنی رائے کو دلائل سے اپنے خیال میں مضبوط پا رہا ہوں اس وجہ سے اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتا کہ اس کو فکر ونظر کے لیے اہل علم کے سامنے پیش کروں' ممکن ہے اس سے ایک اہم دینی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے کچھ نئی راہیں کھلیں۔ پس جو اصحاب علمی دلائل کے ساتھ میری رائے کی کمزوریاں واضح کریں گے میں ان کی رہنمائی کا خیر مقدم کروں گا اور ان کی ہر قوی بات شکریہ اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کروں گا۔ **اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔**

❁ ❁ ❁

پانچویں تحریر:

مسئلۂ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل

(اہلِ علم کے غور و فکر کے لیے)

از: مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

(ترجمان القرآن' ذوالحجہ ۱۳۷۴ھ / اگست ۱۹۵۵ء و محرم ۱۳۷۵ھ / ستمبر ۱۹۵۵ء)

ترجمان القرآن' بابت محرم ۱۳۷۴ھ میں خان محمد صاحب ربانی کا ایک مضمون بعنوان ''حضرات علمائے کرام کی خدمت میں چند سوالات'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں چند ایسے سوال اٹھائے گئے تھے جو ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے تملیک کو رکن یا شرط قرار دینے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے دو مکتوب ترجمان القرآن بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکاتیب میں ان اشکالات کا فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی ہے جو ربانی صاحب نے پیش کیے تھے۔ مجھے مولانا کے بعض پیش کردہ نتائج سے اختلاف ہے' اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطۂ نظر بھی ان صفحات میں پیش کر دوں' تاکہ مولانا اور دوسرے اہل علم ان پر غور کر سکیں۔ بحث کی سہولت کے لیے میں پہلے مولانا ظفر احمد صاحب کے خیالات حتی الامکان خود اُن کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد اپنی ناچیز معروضات پیش کروں گا۔

تملیک کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے:

> ''تملیکِ فقیر'' زکوٰۃ کے لیے شرط ہی نہیں بلکہ رکن ہے' بلکہ زکوٰۃ کی حقیقت ہی ''تملیکِ فقیر'' ہے۔ زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا متفق علیہ ہے' کسی امام کا اس میں اختلاف بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ امام شافعی کی طرف تو یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں ''لام'' ملک کے لیے ہے۔''

تملیک کو ادائیگیٔ زکوٰۃ کی ایک بنیادی شرط مان لینے کے بعد جہاں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں وہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اموالِ زکوٰۃ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس منتقل کرنے کے مصارف بھی زکوٰۃ کی مد سے

نہیں ادا کیے جا سکتے' کیونکہ اس میں تملیکِ فقیر نہیں پائی جاتی۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ زکوٰۃ کی چیزوں کو مدِ زکوٰۃ کے مصارف سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے دو جواب مولانا نے دیے ہیں' ایک یہ کہ:

''جس زمانہ میں زکوٰۃ اسلامی حکومت کے ذریعہ سے وصول کی جاتی تھی اس کی یہ صورت نہ تھی کہ عامل تنہا ہر شخص کے مکان یا چراگاہ پر جاتا اور زکوٰۃ وصول کرتا ہو' بلکہ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا' وہی اس مقام کے تھانہ یا تحصیل میں زکوٰۃ کے مویشی اور اموال جمع کرتے تھے اور اس بستی کے غرباء اسی جگہ جمع ہو جاتے اور ان پر زکوٰۃ تقسیم کر دی جاتی تھی۔ جب تک اس مقام پر فقراء موجود ہوتے دوسرے مقام پر زکوٰۃ منتقل نہ ہوتی تھی۔''

مولانا کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی کہ منتقل کرنے کے مصارف کا سوال پیدا ہو۔ جس کھیت یا کھلیان یا چراگاہ سے زکوٰۃ وصول ہوئی وہیں غرباء و فقراء جمع ہو گئے اور تحصیل داروں نے ان کے اندر زکوٰۃ کے مال کو تقسیم کیا اور دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرا جواب مولانا نے یہ دیا ہے کہ:

''چونکہ ولایتِ عامہ کی وجہ سے امام فقراء کا وکیل ہوتا ہے اور عمال امام کے نائب ہوتے تھے' اگر فقراء کی مصلحت سے زکوٰۃ کو منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو امام اور اس کے عمال کو مصارفِ نقل بھی مالِ زکوٰۃ سے وصول کرنے کا حق تھا۔ جیسا خود فقیر مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کر کے اپنے گھر لے جاتا تو مصارفِ نقل اسی مال سے نکال سکتا تھا..... امام یا مصدِق کا مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کرنا فقراء ہی کا قبضہ کرنا ہے' کیونکہ وہ بوجہ ولایتِ عامہ کے فقراء کا وکیل ہے۔''

مولانا نے ولایتِ عامہ کا یہ حق صرف ایک ایسی اسلامی حکومت کے لیے تسلیم کیا ہے جو آئینِ اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو' محض رسمی اور اسمی قسم کی مسلمان حکومتوں کے لیے مولانا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ وہ ولایتِ عامہ کی مدعی بن کر مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کا مطالبہ کر سکیں۔ مولانا کے اپنے الفاظ یہی ہیں:

''مطالبۂ عشر و زکوٰۃ کا یہ حق اسی حکومتِ مسلمہ کو حاصل ہے جو آئینِ اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو۔ ہر حکومت کو یہ حق حاصل نہیں جو کہ برائے نام ہی اسلامی حکومت ہو اور واقع میں اسلامی حکومت نہ ہو۔''

اس اصولی جواب کے بعد مولانا نے خود ہی خاص پاکستان کی حکومت سے متعلق بھی یہ

بات صاف کر دی ہے کہ یہ وہ اسلامی حکومت نہیں ہے جو مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کے مطالبہ کی حق دار ہو۔ خود اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''یہاں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بڑا مقصد اسلامی سلطنت قائم کرنے سے امورِ دین کا انتظام' احکامِ شرعیہ کا نفاذ' نماز اور صدقات و زکوٰۃ کا نظم اور شریعت کے موافق مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا' جہاد اور سامانِ جہاد کا بندوبست کرنا ہے۔ اگر کسی سلطنت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت ہو۔ اور صدقات و زکوٰۃ وصول کرنے کا حق اسی سلطنت کو حاصل ہے جو اِس مقصد کو پورا کرے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے' ورنہ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔ پس جو لوگ اسلامی سلطنت میں سیاست اور مذہب کو الگ کرنا چاہتے ہیں وہ اسلامی سلطنت قائم نہیں کرنا چاہتے' بلکہ یورپین طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان.....''

اچھا' اگر پاکستان کی حکومت اس بات کی حق دار نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کا مطالبہ کر سکے تو کیا یہاں کے مذہبی اور دینی اداروں اور انجمنوں میں سے کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کی تحصیل کر سکے؟ اس سوال کا جواب مولانا یہ دیتے ہیں:

''عام اداروں کو ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہے اس لیے ان کو فقراء مجہولین کا قائم مقام نہیں کہہ سکتے' صرف زکوٰۃ دینے والوں کا نائب کہہ سکتے ہیں' کیونکہ وہ تو معلوم ہیں۔ پس ان کے قبضہ کو قبضۂ فقراء نہیں کہا جا سکتا' اور ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ کی رقم پہنچنے سے زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی جب تک فقراء کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے۔ اگر یہ ادارے یا ان کے عاملین زکوٰۃ میں سے سفر خرچ وغیرہ نکالیں گے تو زکوٰۃ پوری ادا نہ ہوگی' ادھوری ہوگی۔ پس جو ادارے زکوٰۃ کی تحصیل وصول کے لیے کھڑے ہوں ان کو ولایتِ عامہ حاصل کرنا چاہیے' جس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو یہ حق دیا جائے' یا پھر عامۃ المسلمین باتفاق ان کو یہ حق دے دیں۔ کیونکہ عامۃ المسلمین بھی حکومت کے قائم مقام ہو جاتے ہیں' مگر عامۃ المسلمین کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔''

مولانا کے ان ارشادات کی روشنی میں زکوٰۃ کے مصارف اور اس کی وصول تحصیل سے متعلق جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ بالاجمال مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) زکوٰۃ کی رقم سے غرباء کی اجتماعی خدمت و بہبود کا کوئی چھوٹا یا بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آپ اس سے غریبوں کے محلہ میں کوئی مسجد نہیں بنا سکتے' ان کے لیے تعلیم دین کا کوئی ادارہ نہیں کھول سکتے' ان کی ذہنی اور فکری تربیت کے لیے کوئی اسلامی لائبریری نہیں قائم کر سکتے' ان کے مریضوں کے مفت علاج کے لیے کوئی شفاخانہ نہیں بنا سکتے' غریبوں کے کسی محلہ میں اگر کنواں نہیں ہے تو ان کے پانی پینے کے لیے آپ کنواں بھی نہیں بنوا سکتے' مسافروں کے لیے کوئی سرائے یا تالاب بھی نہیں بنا سکتے۔ الغرض اس قسم کا کوئی کام جو اجتماعی نوعیت رکھتا ہو' خواہ وہ سو فی صدی غریبوں ہی کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو' آپ اس کو زکوٰۃ کی مد سے نہیں کر سکتے' کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرط ہے کہ کسی معین مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنا دیا جائے۔ مذکورہ صورتوں میں یہ شرط مفقود ہے' کیونکہ ان میں فائدہ بہت سے غریبوں کے درمیان مشترک ہو گیا ہے' اس وجہ سے تملیک نہیں پائی گئی۔

(۲) آپ اس زکوٰۃ کی رقم سے کسی غریب کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام بھی نہیں کر سکتے' کیونکہ وہ غریب مر جانے کے سبب سے اس قابل تو رہا نہیں کہ اس مال کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے کفن اور دوسرے سامانِ تجہیز و تدفین کا انتظام کر سکے' اور تملیکِ فقیر کی شرط جو ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے' پوری ہو سکے' اس وجہ سے زکوٰۃ کی مد سے اس کی تجہیز و تکفین نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آپ کسی مُردہ غریب کا قرضہ بھی زکوٰۃ کی رقم سے ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی غلام کو خرید کر آزاد کر سکتے ہیں' کیونکہ ہر چند یہ کام غریبوں کی بڑی خدمت کے ہیں' لیکن تملیکِ فقیر جو ادائے زکوٰۃ کے لیے شرطِ ضروری ہے' ان دونوں صورتوں میں بھی مفقود ہے۔ [مؤخر الذکر چیز کے ناجائز ہونے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے جس پر ہم آگے بحث کریں گے۔]

(۳) کوئی پبلک انجمن یا ادارہ' خواہ اس کی دینی حیثیت کتنی ہی مسلّم کیوں نہ ہو' تحصیلِ زکوٰۃ کا مجاز نہیں ہے۔ اگر کوئی دینی ادارہ یا انجمن اس کام کو کرے تو وہ وصول کردہ زکوٰۃ میں سے ایک پیسہ بھی اس کی وصولی کے مصارف پر خرچ نہیں کر سکتا' ورنہ اس کے بقدر زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔ اس کے لیے جائز صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف وہ زکوٰۃ دینے والوں سے زکوٰۃ وصول کرے' دوسری طرف غریبوں کو اس کا مالک بناتا جائے۔ یا پھر اگر وہ اس رقم کو غریبوں کی تعلیم یا دوسری ضروریات پر اجتماعی طریقے سے خرچ کرنا چاہے تو پھر اس حیلہ سے کام لے جو عموماً ہمارے مدرسوں میں کیا جاتا ہے' یعنی پہلے زکوٰۃ کسی

غریب طالب علم کو دلوائے اور پھر اس طالب علم پر دباؤ ڈال کر اس سے مدرسے یا انجمن کے فنڈ میں وہی رقم بطور عطیہ وصول کر لے۔

(۴) دینی انجمنوں کے لیے اصلی جائز راستہ صرف یہ ہے کہ وہ حکومت سے یا عامۂ مسلمین سے غریبوں کی ولایتِ عامہ کا حق حاصل کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں اس چیز کے حاصل کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے' کیونکہ پاکستان کی حکومت کو' جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے' خود ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہے' تو جو چیز اس کو خود حاصل نہیں ہے وہ چیز وہ کسی دوسرے کو کس طرح بخش سکتی ہے؟ رہے جمہور مسلمین تو ان کے بارے میں خود مولانا ہی نے بالکل صحیح فرمادیا ہے کہ ان کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔

(۵) پاکستان میں ادائیگیٔ زکوٰۃ کی معیاری شکل صرف یہ ہے کہ ہر صاحبِ زکوٰۃ اپنی زکوٰۃ خود نکالے اور خود کسی مستحق کو تلاش کر کے اس کو اس کا مالک بنادے۔

ان ساری باتوں کی بنیاد فقہ حنفی پر بتائی جاتی ہے اور فقہ حنفی کے متعلق عام تصور (اور خود ہمارا تصور بھی) یہ ہے کہ وہ اجتماعی اور سیاسی پہلو سے دوسری فقہوں کے مقابل میں عقل سے قریب تر ہے۔ لیکن زکوٰۃ سے متعلق اس کے ترجمانوں نے یہ تصورات جو دیے ہیں مَیں نہیں سمجھتا کہ ان پر کسی شخص کا قلب بھی پوری طرح مطمئن ہوسکتا ہے۔ زکوٰۃ اسلامی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کوئی اجتماعی نوعیت کا کام نہیں کیا جاسکتا اور غریبوں کی مجموعی بہبود کی اسکیمیں اس سے بروئے کار نہیں لائی جاسکتیں' بلکہ ختم کی دیگ کی طرح اس کا وہیں تقسیم کر دیا جانا لازمی ہے جہاں یہ پکائی گئی ہے تو اس کی افادیت کم از کم موجودہ زمانہ کے اقتصادی ماحول میں تو بمنزلۂ صفر ہو کے رہ جاتی ہے۔ پھر ایک غور وفکر کرنے والا آدمی یہ سوچ کے بھی حیران رہ جاتا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعہ سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام بھی انجام نہیں دیے جاسکتے جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ یہاں تک کہ کسی غریب کی تجہیز وتکفین بھی اس سے عمل میں نہیں آسکتی۔ آگے چل کر اس سے زیادہ حیران کن صورتِ حال یہ سامنے آتی ہے کہ ایک طرف تو اسلام زکوٰۃ کے معاملہ میں اجتماعیت پر اس درجہ زور دیتا ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں کم از کم اموالِ ظاہرہ کی حد تک کسی شخص کا انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا سرے سے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ یا دوسری طرف اسلامی حکومت موجود نہ ہونے کی صورت میں یہ حال ہو جائے کہ ہر شخص کے لیے انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا ہی ایک معیاری طریقہ رہ جائے اور اعلیٰ کے موجود نہ ہونے

کے غصہ میں اعلیٰ سے قریب تر شکلوں کا اہتمام بھی چھوڑ دیا جائے۔

یہ باتیں ایک عام آدمی کے ذہن میں سخت تشویش اور الجھن پیدا کرتی ہیں۔ بالخصوص جب وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ صدقات کی رقوم کو کسی عمدہ اجتماعی کام پر صرف کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ ایک نہایت بدنما حیلے کی آڑ لی جائے' تو خود شریعت کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس وجہ سے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔ اگر فی الواقع دین میں اس کی کوئی بنیاد ہے تو وہ بنیاد معلوم کی جائے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور اگر یہ ایک بے بنیاد چیز ہے تو اس کی بے حقیقتی واضح کر دی جائے' تاکہ بلاوجہ شریعت کے متعلق کسی کے دل میں بدگمانی پیدا نہ ہو۔

تملیکِ شخصی کے نظریہ کی حقیقت

زکوٰۃ کے مصرف اور اس کی وصولی سے متعلق یہ سارے نظریات درحقیقت فرع ہیں ''تملیکِ فقیر'' یا بالفاظِ دیگر ''تملیکِ شخصی'' کے نظریہ کی۔ ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ کسی محتاج اور غریب کو اُس کا مالک بنایا جائے' اس قسم کی تملیک کے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ اس چیز کو ادائیگیٔ زکوٰۃ کی ضروری شرط بلکہ رکنِ زکوٰۃ تسلیم کر لینے سے وہ نتائج آپ سے آپ پیدا ہوتے ہیں جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اس وجہ سے سب سے مقدم یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ یہ نظریہ کس دلیلِ شرعی پر قائم ہے۔

اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں تملیک کا ذکر آتا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ مسائل پیدا ہوئے ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ لیکن مجھے تلاش کے باوجود کہیں اس مسئلہ پر کوئی ایسی بحث نہیں ملی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا ماخذ کتاب وسنت کے اندر کیا ہے' کن تقاضوں سے یہ وجود میں آیا ہے اور کب سے اس نے فقہ حنفی کے اندر ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل کر لی' یہاں تک کہ اس کے متعلق اجماع تک کا دعویٰ کیا جانے لگا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب اور سنت کے اندر اس کی کوئی اصل ہو۔ بغیر اس قسم کی کسی اصل کے کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تملیک کے حق میں اس قسم کی کوئی دلیل قرآن یا حدیث سے ملتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں مَیں صاحب شرح العنایہ علی الہدایہ کا ایک نوٹ نقل کرتا ہوں جو

انہوں نے صاحبِ ہدایہ کے اس دعویٰ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تملیک رکنِ زکوٰۃ ہے۔ اس نوٹ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ نظریہ کتاب وسنت کی کسی دلیل کے اوپر مبنی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ صاحبِ شرح العنایہ فرماتے ہیں:

لان الاصل فی دفع الزکوٰۃ تملیك فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاه جزأ من المال مع قطع منفعة المدفوع عن نفسه مقرونا بالنية ۔ ولقائل ان يقول قولكم التمليك ركن دعوى مجردة اذ ليس فى الادلة النقلية المنقولة فى هذا الباب ما يدل على ذالك خلا قوله تعالىٰ ..... اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ..... وانتم جعلتم اللام للعاقبة دون التمليك۔ والجواب ان معنى قولهم للعاقبة ان المقبوض يصير ملكا لهم فى العاقبة فهم مصارف ابتداً لا مستحقون ثم يحصل لهم الملك فى العاقبة بدلالة اللام فلم تبق دعوى مجردة (حاشیہ فتح القدیر، جلد ثانی، ص ۲۰)

''کیونکہ ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے اصلی چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کے کچھ حصہ کا کسی مسلمان محتاج کو، جو ہاشمی یا کسی ہاشمی کا آزاد کردہ غلام نہ ہو، ادائیگیٔ زکوٰۃ کی نیت کے ساتھ اس طرح مالک بنا دے کہ خود اپنی کوئی غرض اس ادا کردہ مال کے ساتھ وابستہ نہ رکھے۔ ایک معترض اس پر یہ کہہ سکتا ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ تملیک ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے، محض ایک خالی خولی دعویٰ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں جو نقلی دلیلیں وارد ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے اس دعویٰ کا ثبوت مہیا ہوتا ہو۔ لے دے کر اس باب میں جو چیز دلیل کی حیثیت رکھتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ۔ لیکن اس کا حال بھی یہ ہے کہ تم (یعنی حنفیہ) لِلْفُقَرَآءِ کے ''لام'' کو عاقبت کے معنی میں لیتے ہو، تملیک کے معنی میں نہیں لیتے۔ جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ ''لام'' کو جو ہم عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مقبوضہ مال آخر کار ان کی ملک بن جائے گا۔ پس اپنی ابتدائی حیثیت میں تو یہاں فقراء اور مساکین کا ذکر مصارفِ زکوٰۃ بیان کرنے کے پہلو سے ہوا ہے، مستحقین کی حیثیت سے نہیں ہوا ہے، لیکن ''لام'' اس بات پر دلیل ہے کہ بالآخران کو ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ پس تملیک کا دعویٰ محض دعویٰ ہی دعویٰ نہیں رہا۔''

اس نوٹ کو بغور پڑھیے۔ یہ ایک ایسے بلند مرتبہ حنفی عالم کے قلم سے نکلا ہے جنہوں نے

''ہدایہ'' جیسی بلند پایہ کتاب پر حاشیہ لکھا ہے۔ ان کا اپنا اعتراف یہ ہے کہ تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ لے دے کر اگر کسی چیز کو دلیل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو وہ ایک لام ہے جو اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والی آیت میں لفظ ''فقراء'' پر داخل ہے۔ اس ''لام'' کا بھی حال یہ ہے کہ احناف اس کو غالباً شوافع کے استدلال سے بچنے کے لیے تملیک یا استحقاق کے معنی میں نہیں لیتے' بلکہ عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں۔ [اس ''لام'' پر مفصل بحث آگے آ رہی ہے۔ وہیں اس کے بارے میں احناف اور دوسرے ائمہ کے مذاہب پر ہم روشنی ڈالیں گے۔] اوّل تو اس ''لام'' کو عاقبت کے معنی میں لینے کا کوئی تک نہیں ہے' لیکن اگر کوئی شخص اس معنی میں اس کو لے بھی تو بہر حال اس سے تملیک کا مفہوم تو کسی طرح بھی نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اگر بہت تکلف سے کام لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں لام عاقبت لینے کے بعد بھی یہ آیت تملیک کے مفہوم کے خلاف نہیں جاتی اور یہی ان بزرگ عالم نے فرمایا بھی ہے۔ لیکن اتنی بات کچھ بھی مفید طلب نہیں ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کتاب وسنت سے کیا دلیل ہے؟ اگر اس کی کوئی دلیل موجود ہے تو ہم بڑے شوق سے یہ مان لیں گے کہ اس لام کو عاقبت کے معنی میں لینے سے بھی کوئی خاص حرج واقع نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اصل دعویٰ ثابت نہ ہو تو محض لام عاقبت کی اس توجیہہ سے اصل بحث کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ تملیک کا دعویٰ تو اصل توجیہہ کے بعد بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ رہا۔

لام تملیک سے استدلال کی حقیقت

حنفیہ اگرچہ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والی آیت میں ''لام'' کو تملیک کے معنی میں نہیں لیتے اس وجہ سے اس سے ان کے ہاں تملیک پر استدلال کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' لیکن یہ ''لام'' بہر حال ایک بنائے بحث بن سکتا ہے اور اس سے ایک شخص تملیک پر استدلال کر سکتا ہے' جیسا کہ امام شافعی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس سے تملیک پر استدلال کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ لام تملیک کے مفہوم کے لیے ایسا نصِ قطعی ہے کہ تملیک کو ادائے زکوٰۃ کے لیے ایک رکن کی حیثیت دے دی جائے جس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے اور اس کے نتیجہ میں وہ سارے مسائل پیدا کر ڈالے جائیں جن کا صدر مضمون میں ہم نے حوالہ دیا ہے اور جن کے سبب سے زکوٰۃ جیسی اہم چیز کی ساری افادیت بالکل ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس ''لام'' کو تملیک کے مفہوم کے لیے خاص کر دینا ایک

نہایت کمزور بات ہے۔ عربی زبان میں یہ حرف کچھ ایک ہی معنی کے لیے نہیں آتا کہ اس سے حاصل شدہ مفہوم کو شرط اور رکن کا مرتبہ دے دیا جائے۔ حروف کی بحث میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور نحوی شیخ جمال الدین ابن ہشام انصاری کی ''مغنی اللبیب'' ایک مستند ترین کتاب ہے۔ اس فاضل نے غالباً مکہ میں بیٹھ کر یہ کتاب لکھی ہی اس غرض سے تھی کہ یہ قرآن وحدیث کی نحوی مشکلات کے حل کرنے میں رہنمائی کر سکے۔ انہوں نے ''لام'' کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ ۲۲ معنوں کے لیے آتا ہے۔ ان تمام معانی کی تفصیل نقل کرنا تو یہاں مشکل ہے اور غیر ضروری بھی' لیکن اس کے چند معانی کتابِ مذکور سے ہم یہاں درج کرتے ہیں' تاکہ اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکے اور جو لوگ اس کو تملیک کے معنی کے لیے ایک نصِ قطعی بتا رہے ہیں ان کی غلطی واضح ہو سکے۔ علامہ موصوف نے اس حرف کے جو معانی بتائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) استحقاق کے معنی کے لیے' مثلاً: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (شکر حقیقی کا حق دار اللہ ہی ہے)' وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (ماپ تول میں کمی کرنے والے ویل کے مستحق ہیں)

(۲) اختصاص کے معنی کے لیے' مثلاً: اَلْجَنَّةُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (جنت اہل ایمان کے لیے خاص ہے)

(۳) ملکیت کے مفہوم کے لیے' مثلاً: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

(۴) تملیک کے معنی کے لیے' مثلاً: وَهَبْتُ لِزَيْدٍ دِيْنَارًا (میں نے زید کو ایک دینار ہبہ کر دیا)

(۵) تملیک سے ملتے جلتے مفہوم کے لیے' مثلاً: جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (اور تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں)

اوپر ضمناً لامِ عاقبت بھی زیر بحث آ چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی نوعیت بھی معلوم کر لیجیے۔ سترہویں نمبر پر اس کا ذکر اس طرح آتا ہے: ''لام صیرورۃ جس کو لامِ عاقبت اور لامِ مآل بھی کہتے ہیں۔ مثلاً: فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (اور اس کو (موسیٰ کو) فرعون کے گھر والوں نے دریا سے نکال لیا' تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور غم کا کانٹا بنے)''۔

یہ لامِ جر کے ۲۲ معنوں میں سے ہم نے صرف چند کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے اس کی

وسعت کا اندازہ کیجیے۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ صاحب مغنی اللبیب حتی الوسع ہر مفہوم کی مثالیں قرآن وحدیث سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن تملیک کے مفہوم کی وضاحت کے لیے انہوں نے قرآن کی کوئی مثال دینے کے بجائے عربی زبان کا ایک عام فقرہ ''وَهَبْتُ لِزَيْدٍ دِينَارًا'' نقل کر دیا ہے۔ اگر آیت ''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ'' کی ''لام'' تملیک کے مفہوم کے لیے کوئی واضح اور قطعی چیز ہوتی تو ابن ہشام کے ذوق کے یہ بات بالکل خلاف تھی کہ وہ قرآن کی ایک مثال نظر انداز کر کے ایک کمتر درجہ کی مثال پیش کرتے۔

بہر حال تملیک کے نظریہ کی عمارت اگر لِلْفُقَرَآءِ کی لام ہی پر کھڑی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ بنیاد نہایت کمزور ہے۔ اوّل تو اس کے مفہوم ہی کے بارہ میں بڑے اختلافات ہیں۔ احناف اس کو لامِ عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں' جیسا کہ شارح ہدایہ کے اس نوٹ سے مترشح ہوتا ہے جس کا اوپر ہم نے حوالہ دیا ہے۔ مالکیہ اس کو لامِ اجل کے مفہوم میں لیتے ہیں' جیسا کہ قاضی ابن عربی نے احکام القرآن میں بتصریح لکھا ہے۔ صرف امام شافعی کے متعلق یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ اس کو تملیک کے معنی میں لیتے ہیں۔ ثانیاً اگر یہ اختلاف نہ بھی ہوتا جب بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ آیت میں تملیک کے مفہوم کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ اور اس کی حیثیت محض ایک استنباط کی ہوتی' نہ کہ ایک نص قطعی کی جس کی بنا پر تملیک کو ادائے زکوٰۃ کے لیے رکن یا شرطِ لازم قرار دے دیا جائے۔

میرے نزدیک یہاں لام یا تو استحقاق و اختصاص کے مفہوم کے لیے ہے یا انتفاع و افادہ کے مفہوم کے لیے' تملیک کے مفہوم کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ سیاق و سباقِ کلام اس مفہوم سے ابا کرتا ہے۔

سب سے پہلے نظمِ کلام کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیجیے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والی آیت جس سیاق و سباق میں ہے وہ یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾ (التوبة)

''اور ان منافقین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہیں صدقات کی تقسیم کے بارہ میں متہم کرتے ہیں۔ اگر اس میں سے انہیں بھی ان کی خواہش کے بقدر دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو بگڑ بیٹھتے ہیں' حالانکہ اگر وہ اس پر قناعت کرتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے' اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا اور اس کا رسول بھی ہمیں عطا فرمائے گا' ہم تو اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں (تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی)۔ خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور اُن کارکنوں کا جو مالِ خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور اُن لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے' نیز گردنیں چھڑانے میں اور زیر باروں کے قرضہ میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی ضروریات میں (اس کو خرچ کیا جائے)۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔''

دیکھئے' یہاں اوپر والی آیت میں ذکر اُن منافقین کا تھا جن کا نبی ﷺ کے ساتھ حسنِ ظن اور سوءظن تمام تر اغراض پر مبنی تھا۔ اگر خیرات کے مال میں سے ان کی خواہش کے بقدر انہیں مل جاتا تو نبی ﷺ کی خوب خوب تعریفیں کرتے اور خواہش کے بقدر نہ ملتا تو آپ کو متہم کرنے سے بھی باز نہ رہتے' آپ پر بے جا جانبداری اور ناروا پاسداری کا الزام لگاتے اور طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتے۔ غور کیجیے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات کیا ہو سکتی ہے؟ یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے یا یہ کہ زکوٰۃ و خیرات کی رقموں کے اصلی حق دار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات یہ دوسری ہی ہو سکتی ہے نہ کہ پہلی۔ چنانچہ مفسرین میں سے جن لوگوں کی نظر سیاق و سباق پر رہتی ہے انہوں نے آیت کی یہی تأویل کی بھی ہے۔ صاحب کشاف اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ کی تأویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قصر لجنس الصدقات على الاصناف المعدودة وانها مختصة بها لا تتجاوزها الى غيرها كانه قيل انما هى لهم لا لغيرهم ونحوه قولك انما الخلافة لقريش تريد لا تتعداهم ولا تكون لغيرهم

''یہاں زکوٰۃ و صدقات کو مذکورہ اقسام پر محدود کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ انہی کے لیے خاص ہے' دوسروں کی طرف یہ چیز منتقل نہیں ہو سکتی۔ گویا یہ بات کہی گئی کہ یہ چیز انہی

کے لیے ہے' ان کے ماسوا لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ تم کہو کہ انما الخلافة لقریش (خلافت تو بس قریش کے لیے ہے) یعنی یہ ان کے سوا دوسروں کا حق نہیں ہے۔''

پس ''لام'' یہاں جس چیز کو ظاہر کر رہا ہے وہ صرف خیرات وصدقات کا مذکورہ اصناف کے لیے خاص ہونا ظاہر کر رہا ہے' نہ تملیک کے معاملہ سے اس کو کوئی تعلق ہے اور نہ اس مسئلہ سے اس کو کوئی واسطہ ہے کہ یہ تمام اصناف بیک وقت اس کی حق دار ہیں' یا ان میں سے مصلحت کے تحت کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے یا ان میں سے کسی ایک ہی کو اس کا مصرف بنایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد آیت کی اندرونی تالیف پر غور کر کے دیکھئے کہ خود اس کے مختلف اجزاء کی باہمی مناسبت کا تقاضا کیا ہے۔ آیت کے اندر' جیسا کہ بالکل واضح ہے' آٹھ اصناف کا بحیثیت مصارفِ خیر کے ذکر ہے' جن میں سے ابتدائی چار کا ذکر ''لام'' کے تحت ہے اور چار کا ذکر ''فِیْ'' کے تحت۔ ظاہر ہے کہ کلام میں یہاں کوئی ایسی ہی تقدیر ماننا مناسب ہوگا جو ''لام'' کے ساتھ بھی مربوط ہو سکے اور ''فِیْ'' کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے۔ اگر لام کو تملیک کے معنی میں لیجیے تو آیت کا ابتدائی حصہ اس کے آخری حصہ سے بالکل ہی بے ربط ہو کے رہ جائے گا' کیونکہ فِیْ میں بہرحال تملیکیت کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اگر اس کے اندر پایا جاتا ہے تو افادیت اور خدمت ومصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ((مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ)) ''جب تک کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کے کام میں یا اس کے مصالح کی خدمت میں رہتا ہے''۔ پس آیت کے دونوں حصوں کی ہم آہنگی کا اقتضاء یہ ہے کہ یہاں لام کو استحقاق یا انتفاع کے مفہوم میں لیا جائے تاکہ ایک ہی تقدیر کے تحت پوری آیت کی تاویل ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا' بلکہ لام میں تملیک کا مفہوم لیا گیا' تو آخری چار اصناف کے ساتھ تملیکیت کا مفہوم جوڑنے کے لیے کلام کی وسعت اور اس کی بلاغت کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا' جیسا کہ فی الواقع کیا بھی گیا ہے اور جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس ادبی نکتہ کی طرف ابن منیر نے کشاف کے حاشیہ الانتصاف میں توجہ دلائی ہے:

فاما ان یکون التقدیر انما الصدقات مصروفة للفقراء کقول مالك او مملوکة کقول الشافعی لکن الاول متعین لانه تقدیر یکتفی به فی الحرفین (الانتصاف حاشیہ کشاف لابن منیر)

''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں تقدیر کلام یا تو یہ ہوگی کہ صدقات فقراء کے لیے صرف کیے جائیں گے' جیسا کہ امام مالک کہتے ہیں' یا یہ ہوگی کہ صدقات فقراء کی ملکیت ہیں' جیسا کہ امام شافعی کا قول ہے' لیکن یہاں پہلی تقدیر متعین ہو جاتی ہے' کیونکہ یہ دونوں حرفوں (ل اور فی) کے ساتھ یکساں طور پر ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔''

تملیک کی بعض دوسری دلیلیں

اس لام کے علاوہ مجھے فقہ کی مشہور و متداول کتابوں میں تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کوئی دلیل باوجود تلاش کے نہیں ملی' اور اگر ملی بھی ہے تو اس کا تملیک کی دلیل ہونا کم از کم اس عاجز پر کسی پہلو سے بھی واضح نہیں ہو سکا۔ تاہم چونکہ اسی طرح کی بعض مبہم چیزوں کو بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے اس وجہ سے میں ان پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے بدائع الصنائع کے حوالہ سے تملیک کی مندرجۂ ذیل دلیلیں اپنے مضمون میں نقل فرمائی ہیں:

وقد امر الله تعالى الملاك بايتاءِ الزكوةِ بقوله عزوجل وَاٰتُوا الزَّكٰوة والايتاء هو التمليك ولذا سمى الله تعالى الزَّكٰوةَ صدقة بقوله اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والتصدق تمليك

''اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم وَاٰتُوا الزَّکٰوۃ کے ذریعہ سے مالکینِ نصاب کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور ''ایتاء'' تملیک ہی ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نام صدقہ رکھا ہے۔ ارشاد ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور تصدق وہی تملیک ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

واما ركنه فهو التمليك لقوله تعالى وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ والايتاء هو التمليك (بدائع الصنائع' ج۲' ص ٦٥)

''رہا زکوٰۃ کا رکن تو وہ تملیک ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق دو) یہاں ایتاء سے مقصود وہی تملیک ہے۔''

تملیک کی تائید میں جن نصوص کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

واما النص فقوله تعالى اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وقوله عزوجل وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ' والاضافة بحرف اللام

تقتضی الاختصاص بجهة الملك اذا كان المضاف اليه من اهل الملك (بدائع' ج ۲' ص ٤'٥)

''رہا تملیک کے ثبوت میں نص تو اللہ تعالیٰ کا قول : اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ (خیرات کا مال تو بس غریبوں کے لیے ہے) ہے۔ اور دوسری آیت ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے ایک متعین حق ہے)۔ حرفِ لام کے ذریعہ سے جب اضافت ہو تو وہ ملکیت کے پہلو سے اختصاص کو چاہتی ہے بشرطیکہ مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو''۔

بس یہی دلیلیں ہیں جو تملیک کی تائید میں فقہ کی مختلف کتابوں میں دہرا دہرا کر پیش کی گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ کی حقیقت ہی تملیک ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ لِلْفُقَرَآءِ اور لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ میں جو لام ہے وہ اختصاصِ ملک کا مقتضی ہے اگر مضاف الیہ اہلِ ملک میں سے ہو۔

جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے' یہ گزارش ہے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ میں بعض جگہ تملیک کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے' لیکن اس میں بہت کچھ دخل قرینہ اور سیاق وسباق کو ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان الفاظ ہی کے اندر تملیک کا مفہوم داخل ہو اور جب یہ بولے جائیں تو تملیک کا مفہوم ان کے اندر سے آپ ہی آپ نکل آئے۔ اگر ایسا ہوتا تب تو بلاشبہ ان کو تملیک کے ثبوت میں بطور نص کے پیش کیا جا سکتا تھا' لیکن یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے' ورنہ ہمیں اٰتَیْنَاهُمُ الْكِتٰبَ (ہم نے ان کو کتاب دی) اور وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی) میں بھی تملیک کا مفہوم لینا پڑے گا' حالانکہ ان میں اور اس طرح کے بے شمار استعمالات میں تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ پس دیکھنا یہ ہے کہ جہاں جہاں قرآن یا حدیث میں یہ الفاظ ادائے زکوٰۃ وخیرات کے لیے بولے گئے ہیں وہاں بے تکلف تملیک کی طرف ذہن جاتا ہے یا نہیں۔ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی ''اٰتُوا الزَّکٰوۃ'' یا 'تَصَدَّقُوْا'' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں متبادر مفہوم ان الفاظ کا صرف یہی ہے کہ زکوٰۃ دو اور صدقہ دو۔ سارا زور صدقہ اور زکوٰۃ ادا کرنے پر ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ادائیگی تملیکِ فقیر کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ یہ چیز اٰتُوْا اور تَصَدَّقُوْا کے الفاظ سے نہیں نکلتی۔ اگر اس کی کوئی

اور دلیل ہو تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے' لیکن محض اٰتُوا اور تَصَدَّقُوا کے سہارے پر تملیک کو ادائیگیٔ زکوٰۃ کا رکن نہیں قرار دیا جا سکتا۔

چند مثالیں میں قرآن سے پیش کرتا ہوں' ان کو ملاحظہ فرمائیے:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ ؕ﴾ (التوبۃ:۵)

''پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔''

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ (الحج:۴۱)

''جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم ملک میں ان کو اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔''

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ﴾ (المؤمنون:۶۰)

''اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اس کو خدا سے ڈرتے ہوئے دیتے ہیں۔''

یہ چند آیتیں ہم نے بغیر کسی انتخاب کے نقل کر دی ہیں' ان کو خالی الذہن ہو کر پڑھیے اور پھر غور کیجیے کہ ان میں سارا زور زکوٰۃ کے ادا کرنے کے مفہوم پر ہے یا تملیکِ فقیر کے وجوب پر؟ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اُن سے تعرض نہ کیا جائے یا یہ بتانا چاہتا ہے کہ جب تک یہ تملیکِ فقیر نہ کر دیں ان کا پیچھا نہ چھوڑا جائے؟ اسی طرح تیسری آیت پر نگاہ ڈالیے۔ اس میں ''ایتاء'' کا لفظ موجود ہے' لیکن اس سے مقصود ان لوگوں کی انفاق فی سبیل اللہ کی خصلت کا اظہار ہے یا اس بات کا اظہار کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے تملیکِ فقیر کیا کرتے ہیں؟ [یہ لفظ متعدد جگہ قرآن میں تملیک اجتماعی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔]

اب آیئے دو آیتیں 'تصدق' سے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے:

﴿فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (المنٰفقون)

''پس میں صدقہ کرتا اور نیکوکاروں میں سے بنتا۔''

فرمائیے اس کا مطلب یہ ہے کہ میں مختلف طریقوں سے اللہ کی راہ میں اور غرباء کی بہبود کے کاموں میں فیاضی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا یا یہ ہے کہ میں تملیکِ فقیر کیا کرتا؟

﴿وَمِنْھُمْ مَّنْ عٰھَدَ اللّٰہَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِہٖ لَنَصَّدَّقَنَّ﴾ (التوبۃ:۷۵)

''ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے

فضل سے نوازا تو ہم صدقہ کیا کریں گے۔''

فرمائیے کہ اس قول کے قائلین کے ذہن میں یہ مضمون تھا کہ اگر ہمیں مال ملا تو ہم تملیکِ فقیر کیا کریں گے یا یہ مقصد تھا کہ اگر ہم کو مال ملا تو ہم اللہ کے راستے میں مختلف طریقوں سے خرچ کریں گے؟ قطع نظر اس سے کہ تملیک ہو یا نہ ہو۔

ان مثالوں کے ذکر سے ہمارا مقصد محض اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ 'ایتاء' یا 'تصدق' کے الفاظ تملیک کے معنی یا مفہوم کے لیے ایسے قطعی نہیں ہیں کہ آپ ان کو تملیک کے ثبوت میں نص کی حیثیت سے پیش کریں۔ ان سے اصلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ دینا یا خرچ کرنا ہے۔ یہ دینا اور خرچ کرنا تملیک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور بغیر اس کے بھی ہو سکتا ہے۔ تملیک پر اس قدر اصرار (اور وہ بھی تملیک کی ایک خاص نوعیت پر) کہ اس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے' یہاں تک کہ کوئی شخص زکوٰۃ کے پیسوں سے کسی غریب میت کے لیے کفن بھی نہ خرید سکے' کسی غریب مُردہ کا قرض بھی ادا نہ کر سکے' میرے نزدیک ایک بالکل بے حقیقت بات ہے۔

دوسری دلیل میں بنائے استدلال تمام تر ''لام'' پر قائم ہے جس کی پوری حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں۔ البتہ یہ پہلو اس میں نیا ہے کہ لام کو تملیک کے بجائے اختصاص کے مفہوم میں لے کر اس سے اختصاصِ ملک کا مضمون نکالا گیا ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر اضافت ''لام'' کے ذریعہ سے ہو اور مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو تو وہ اختصاصِ ملک پر دلیل ہے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے۔ ہم اَلْفَرَسُ لِلرَّاکِبِ (گھوڑا سوار کے لیے ہے) اور اَلْمِنْبَرُ لِلْخَطِیْبِ (منبر خطیب کے لیے ہے) بولتے ہیں۔ ان میں اضافت بھی لام کے ذریعہ سے ہے اور مضاف الیہ بھی دونوں جملوں میں اہل ملک میں سے ہیں' لیکن ان سے کوئی شخص بھی اختصاصِ ملک نہیں سمجھتا' بلکہ صرف ایک نوعیت کا اختصاص سمجھتا ہے۔ پھر اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ میں اختصاصِ ملک کا مضمون کہاں سے آ جائے گا؟ بہرحال اگر اس استدلال کو تھوڑی دیر کے لیے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک استنباط کی ہوئی۔ اس کا یہ درجہ نہیں ہے کہ اس کو ایک رکنِ دین قرار دے دیا جائے اور جہاں اس کی کسی سے کوئی ادنیٰ قسم کی خلاف ورزی صادر ہوئی تو اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ ایک حکمِ شرعی کا منکر ہے۔

کیا ایک مقام کی زکوٰۃ دوسرے مقام پر صرف نہیں ہوسکتی؟

دوسری چیز جو مولانا ظفر احمد صاحب کے مضمون میں نہایت قابل غور اور اہل علم کے فکر و نظر کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اُس کی تقسیم کا معیاری طریقہ صرف یہ ہے کہ محصلینِ زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں' کھلیانوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں' زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غرباء میں تقسیم کر دیں۔ اور جب تک اس علاقہ میں غرباء و مستحقین موجود ہوں دوسری جگہ اس علاقہ کی زکوٰۃ منتقل نہ کریں۔

قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص و تحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں' اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں' اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں' کم از کم زکوٰۃ کی مد سے ان کی اصلاح و ترقی میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا' کیونکہ پست حال علاقوں میں قدرتی طور پر زکوٰۃ کی آمدنی بہت تھوڑی ہوگی اور دوسرے علاقوں کی زکوٰۃ ان علاقوں کی امداد کے لیے مشکل ہی سے کچھ منتقل کی جا سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دُور رَس اور مفید اسکیم پر خرچ نہیں کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے۔ حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے' منصوبہ بندی کے ذریعے سے اگر کوئی حکومت چاہے تو دیکھتے دیکھتے' اپنے انہی ذرائع سے کام لے کر جو منتشر طور پر استعمال ہونے کے سبب سے کوئی مؤثر نتیجہ پیدا نہیں کر رہے ہیں' اپنے ملک کے غریبوں کی کایا پلٹ دے سکتی ہے۔ ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ اگر اسلام کا اقتصادی نظام ملک میں جاری ہو جائے تو غریبوں کے آسمان و زمین بدل جائیں گے۔ لیکن اگر غریبوں کے حصہ کی اصلی آمدنی کا یہی حشر ہوا کہ ہر تھانہ کی زکوٰۃ اسی تھانہ میں تقسیم ہو گئی تو اشتراکیت کا مقابلہ کرنا تو الگ رہا' شاید ہم زکوٰۃ کی آمدنی سے غریبوں کی بے شمار مشکلات میں سے کوئی ایک مشکل بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نبی ﷺ اور صحابہؓ کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی عموماً یہی رہی ہے کہ جس جگہ سے زکوٰۃ وصول کی جائے' اگر حقیقی ضرورت وہاں موجود ہو تو وہیں خرچ بھی کر دی جائے' وہاں سے مرکز کو منتقل نہ کی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو

محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ ہر تھانہ بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اُسی تھانہ اور اُسی بستی میں تقسیم کر دی جائے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے۔ اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ وہ چاہے تو ہر تھانہ اور ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ یا بستی میں تقسیم کرا دے' چاہے تو کسی خاص علاقہ میں (اگر اس علاقہ میں ایمرجنسی کی صورت پیدا ہو گئی ہو) پورے ملک کی زکوٰۃ اکٹھی کر کے خرچ کر دے۔ اور اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کر کے اس کو ملک کے غرباء کی کسی نفع بخش اسکیم میں لگا دے' جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔

اس کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ اگر مقصود انفرادی تقسیم ہی تھی تو زکوٰۃ کے معاملہ کو حکومت کے ہاتھ میں دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ حکومت کے ہاتھ میں تو دیے ہی وہ معاملات جاتے ہیں جن کے اندر کوئی اجتماعی نوعیت کا تصرف پیش نظر ہو۔ اگر یہ چیز مقصود نہیں تھی تو اوّل تو حکومت کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ سرے سے اس کو ہاتھ میں لیتی ہی نہ' اور اگر لیتی بھی تو بس اس حد تک کہ اس کے عمال ہر جگہ صرف اس بات کی نگرانی کرتے رہتے کہ لوگ اپنی اپنی زکوٰتیں نکالیں اور غرباء میں تقسیم کر دیں۔ اگر لوگ اس میں سست پڑتے نظر آتے تو ان کو ترغیب یا ترہیب سے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ محض انتظامی نوعیت کا نہ ہوتا' بلکہ شریعت کا حکم ہی یہ ہوتا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ ہو تو کم از کم صدرِ اوّل میں تو اس کا امکان نہیں تھا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کی جا سکتی۔ لیکن ہم صاف دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں مرکزی حکومت براہِ راست اپنی ہدایات کے تحت زکوٰۃ کو منتقل بھی کراتی ہے اور نہیں بھی کراتی ہے' کبھی اپنا حصہ کچھ مقرر کر لیتی ہے کبھی کچھ کر لیتی ہے' بلا لحاظ اس کے کہ مقامی غرباء کی ضروریات پوری ہو چکی ہیں یا نہیں؟ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قانون کے تحت سارے اختیارات حکومت کو حاصل ہیں۔ وہ مختلف علاقوں کے حالات اور غرباء کے مصالح کے تحت اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہے۔ ذیل میں ہم اہل علم کے غور کرنے کے لیے اپنے خیال کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں مدینہ میں مہاجرین کا مسئلہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا اُس زمانہ میں اطرافِ مدینہ کی زکوٰۃ بڑے اہتمام کے ساتھ وصول کرا کے مدینہ منگوائی جاتی تھی' تاکہ مہاجرین کی مشکلات حل کی جا سکیں۔ یہاں تک کہ ایک اعرابی نے

آنحضرت ﷺ سے وصولیٔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں عمال کے رویہ کی سختی کی شکایت کی کہ صدقہ کی ایک بکری کی خاطر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں۔ حضور ﷺ نے اس کے جواب میں اس سختی کے لیے جو وجہ بیان فرمائی وہ یہ تھی کہ:

((لَوْ لَا اَنَّهَا تُعْطٰى فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ مَا اَخَذْتُهَا))

(نیل الاوطار' ج ۳' ص ۱۶۱)

''اگر یہ چیز غریب مہاجرین کو نہ دینی ہوتی تو میں اس کو نہ لیتا۔''

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حوالیٔ مدینہ کی زکوٰۃ وصول کرا کے مدینہ منگوانے کی اصل وجہ یہی تھی کہ مدینہ میں بے سہارا مہاجرین کا مسئلہ ایک پریشان کن مسئلہ بنا ہوا تھا جس کو حکومت کے لیے حل کرنا ضروری تھا۔ یہ وجہ نہ تھی کہ حوالیٔ مدینہ میں زکوٰۃ کے مستحقین موجود ہی نہ تھے۔

اسی مہاجرین کے مسئلہ کے سبب سے اہل یمن کے ساتھ زکوٰۃ کے معاملہ میں دو مختلف زمانوں میں دو مختلف پالیسیاں اختیار کی گئیں۔ جس زمانہ میں مہاجرین کا مسئلہ پیچیدہ بنا ہوا تھا اور غالباً کپڑوں کی ان کے لیے شدید ضرورت تھی' اس زمانہ میں یمن میں آنحضرت ﷺ کے نمائندے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن سے اُن کے صدقات کی تمام اصناف و اجناس کے بدلہ میں صرف نئے اور پرانے کپڑے وصول کیے اور وہ سارے کپڑے مہاجرین کے لیے مدینہ روانہ کر دیے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی کم اہم ضروریات کے مقابل میں انہوں نے مہاجرین کی زیادہ اہم ضرورت کو مقدم رکھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اعلان کے الفاظ ملاحظہ ہوں جس سے صاف وہ مفہوم نکلتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے:

ایتونی بکل خمیس ولبیس آخذہ منکم مکان الصدقة فانه ارفق بکم وانفع للمهاجرین والانصار بالمدینة (نیل الاوطار' ج ۳' ص ۱۶۱)

''تم میرے پاس ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے لاؤ' میں صدقہ کے معاوضہ میں ان کو قبول کر لوں گا۔ اس میں تمہیں آسانی ہو جائے گی اور مدینہ کے مہاجرین اور انصار کا بھلا ہو جائے گا''۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ان کپڑوں کے مدینہ بھیجنے کا سبب صرف یہ تھا کہ یمن میں اس کے مستحقین موجود نہیں تھے؟ مستحقین رہے ہوں گے' لیکن مدینہ کے مستحقین کا معاملہ مختلف پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا' اس وجہ سے ان کو مقامی مستحقین پر ترجیح دی گئی۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب یہ مہاجرین کا مسئلہ بالکل حل ہو گیا تو اسی یمن

کی زکوٰۃ کا صرف ایک تہائی حصہ انہی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے مدینہ بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا کہ میں نے تمہیں ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا ہے' اس لیے بھیجا ہے کہ وہاں کے مال داروں سے وصول کرو اور وہیں کے غریبوں میں تقسیم کر دو۔ اور جب تک حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ اطمینان نہیں دلا دیا کہ یہاں زکوٰۃ کے مزید حق دار موجود ہی نہیں ہیں اس وقت تک انہوں نے وہاں کی زکوٰۃ مدینہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی طرح ایک سے زیادہ مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ مرکز نے کسی مقام کی زکوٰۃ میں اپنا ایک متعین حصہ مقرر کر دیا ہے اور اس بات کی کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ مرکز کا حصہ صرف اس حالت میں مرکز کو بھیجا جائے جبکہ کوئی مقامی مستحق موجود نہ ہو۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ابوعبید نے یہ روایت نقل کی ہے:

> **قال لابن ابی ذباب وبعثه بعد عام الرمادة فقال اعقل علیهم عقالین فاقسم فیهم احدهما وأتنی بالآخر** (کتاب الاموال' ص ٦٠٠)

> ''عام الرمادہ کے قحط کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کی تحصیل کا کام روک دیا تھا۔ جب قحط دور ہو گیا تو انہوں نے ابوذباب کو تحصیل زکوٰۃ کے کام پر مقرر کیا اور ان کو یہ حکم دیا کہ لوگوں سے اکٹھے دو سالوں کی زکوٰۃ وصول کرو' آدھی ان میں تقسیم کر دو' آدھی میرے پاس بھیج دو''۔

اسی طرح ایک روایت حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے متعلق بھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اموالِ زکوٰۃ میں مرکز کا آدھا حصہ مقرر کیا۔ پھر دوسرے سال جب انہوں نے مرکز کے لیے ضرورت نہیں محسوس کی تو ہر جگہ کی زکوٰۃ مقامی طور پر ہی تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا:

> **عن ابن جریج قال کتب عمر بن عبدالعزیز الی عُمّاله ان ضعوا شطر الصدقة وابعثوا اليَّ شطرها قال ثم کتب فی العام المقبل ان ضعوها کلها** (کتاب الاموال' ص ٥٩٤)

> ''ابن جریج راوی ہیں کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے تحصیل داروں کو لکھا کہ زکوٰۃ کی آدھی رقم مقامی ضروریات کے لیے رکھ چھوڑو اور آدھی میرے پاس بھیج دو۔ پھر دوسرے سال انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ ساری کی ساری مقامی ضروریات ہی کے لیے رکھ چھوڑ دو۔''

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم سے متعلق یہ تصور کچھ بہت صحیح نہیں ہے کہ ہر گاؤں اور ہر تھانہ کی زکوٰۃ وہیں وصول کر کے کھڑے کھڑے تقسیم کر دی جائے' بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا' یہ معاملہ تمام تر حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو مقامی طور پر تقسیم کرادے' چاہے تو اس میں مرکز کا کوئی متعین حصہ مقرر کر دے' چاہے تو کسی اہم ضرورت کے پیش نظر کسی علاقہ کی پوری زکوٰۃ کسی دوسرے علاقہ کے غرباء کی امداد کے لیے اس علاقہ میں بھیج دے۔ اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ مرکزی کنٹرول میں لے کر زکوٰۃ کے مذکورہ مصارف میں سے کسی ایک ہی مصرف پر صرف کرے یا ملک کے غرباء کی اجتماعی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر صرف کرے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا ہے تو ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ ((خُذْهَا مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَضَعْهَا فِيْ فُقَرَائِهِمْ)) ''اُن کے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کرو اور اُن کے غریبوں میں اُس کو بانٹ دو''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ہر جگہ کے مقامی مال داروں کی زکوٰۃ کے اصلی مستحق اسی مقام کے غرباء ہیں۔ ہمارے نزدیک اس شبہ کی بنیاد کچھ قوی معلوم نہیں ہوتی' کیونکہ خود حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی نبی ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے تو یہ بات کس طرح ممکن تھی کہ وہ اس حکم کے بالکل خلاف اہل یمن کے سامنے یہ اعلان کرتے کہ:

> **اِیتونی بکل خمیس ولبیس آخذہ منکم مکان الصدقۃ فانہ ارفق بکم وانفع للمھاجرین والانصار بالمدینۃ**
>
> ''ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے میرے پاس لاؤ' میں صدقہ کی جگہ ان کو قبول کروں گا۔ اس میں تمہیں بھی آسانی ہو گی اور مدینہ کے مہاجرین و انصار کا بھی بھلا ہو گا''۔

اب یا تو یہ ہو کہ عام پالیسی تو یہی رہی ہو کہ مقامی اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کر کے وہیں مقامی غرباء میں تقسیم کر دی جائے' لیکن خاص مرکز کی ہدایت کے تحت مہاجرین کی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے کسی سال اہل یمن سے مذکورہ بالا مطالبہ کیا ہو' یا یہ ہو کہ انہوں نے ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَآئِهِمْ)) کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہو اور ایک انتظامی حکم کی حیثیت سے حالات اور مصالح کے تحت جب جیسا مناسب خیال کیا ہو اُس پر عمل

کیا ہو۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں سے جو شکل بھی فرض کی جائے یہ چیز بالکل صاف واضح ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں تقسیم کی جائے۔

پبلک اداروں کی حیثیت

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے وصول کرنے اور اس کو تقسیم کرنے کا فریضہ اصلاً ایک اسلامی حکومت ہی سے متعلق ہے۔ وہی جائز طور پر اس بات کی حق دار ہے کہ مال داروں سے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرے اور اس کے مصارف میں اس کو صرف کرے۔ لیکن اگر کسی جگہ کے مسلمان ایک صحیح اسلامی حکومت یا کم از کم جائز قسم کی اسلامی حکومت کی برکت سے محروم ہوں تو اُن کے لیے صحیح طریقہ کیا ہے؟ کیا یہ کہ اُن میں سے ہر شخص خود مستحقین کو تلاش کر کے اُن میں اپنی زکوٰۃ تقسیم کر دے یا یہ کہ زکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے انہیں اپنے اندر کوئی اجتماعی نظم پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے ذریعہ سے زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ممکن حد تک کوئی مناسب بندوبست کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں میرا رجحان یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ دوسری ہی صورت صحیح ہے۔ میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اسلام کا مزاج یہ ہے کہ اگر اس کے احکام میں سے کسی حکم کی بجا آوری اس کی اصلی معیاری شکل میں کسی مانع کے سبب سے ممکن نہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کسی ایسی شکل میں کی جائے جو اصلی شکل سے ملتی جلتی یا کم از کم ذہنوں کے اندر اصلی شکل کی یاد محفوظ کرانے والی ہو تاکہ اصلی حالت کی طرف لوٹنے اور اس کو دوبارہ حاصل کرنے کا شوق دلوں کے اندر قائم رہے۔ چنانچہ جب وضو کرنا کسی مانع کے سبب سے ممکن نہیں ہوتا ہے تو اس کی جگہ پر تیمم کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر نماز اس کی اصلی صورت میں ادا کرنی ممکن نہ ہو تو اس سے قریب تر صورت پر اس کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جنگ کے خطرناک ترین حالات کے اندر بھی اس کے لیے ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جس سے اس کی اصلی صورت کا تصور ذہنوں میں باقی رہ سکے۔ یہی صورتِ حال دین کے دوسرے احکام کے اندر بھی ہے۔ اگر ان کو اُس معیاری شکل میں ادا نہیں کیا جا سکتا ہے جو قرآن یا حدیث میں ان کے لیے تجویز کی گئی ہے تو حالات کے لحاظ سے اصل سے ممکن حد تک قریب تر شکل میں ان کو ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کلیہ کو پیش نظر رکھ کر اگر زیر بحث سوال پر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح معلوم

ہوتی ہے کہ چونکہ زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کا کام دین میں اجتماعی طور پر مطلوب ہے اور اس کے انجام دینے کی اصلی مجاز اور حق دار درحقیقت ایک اسلامی حکومت ہی ہے' اس وجہ سے اس کی عدم موجودگی میں دین کے مزاج سے اقرب بات یہی ہوگی کہ مسلمانوں کے اندر جس طرح کا نظام شرعی بھی موجود ہو اسی کو اس فرض کی انجام دہی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کی بھی کوئی اجتماعی تنظیم دینی باقی نہ رہ گئی ہو تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی ایک ہی تنظیم قائم نہ ہو سکے تو اصل سے قریب تر لانے کے لیے یہ شکل بھی گوارا کی جا سکتی ہے کہ ایک سے زیادہ تنظیمیں ہوں جو اپنے اپنے حلقۂ اثر اور اپنے اپنے دائرۂ اعتماد کے اندر اس فرض کو انجام دیں۔ اگرچہ ایک تنظیم کی جگہ کئی تنظیموں کا ہونا ایک انتشار کی صورت ہے لیکن اصل نصب العین سے ذہنوں کو وابستہ رکھنے کے لیے یہ اس کے مقابل میں کہیں بہتر ہے کہ سرے سے کوئی نظم ہی باقی نہ رہ جائے اور ایک کامل انتشار کی حالت طاری ہو جائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی نوعیت کی بھی کوئی تنظیم باقی نہ رہ جائے یا کسی تنظیم کے بھی' جو موجود ہو' استحقاق کو تسلیم نہ کیا جائے' بلکہ ایک ایک شخص پر اُس کی زکوٰۃ کے ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری ڈال دی جائے تو یہ چیز اغنیاء کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مضر ہوگی اور غرباء کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مہلک ہوگی۔ اوّل تو کسی محرک یا داعی کے نہ ہونے کے سبب سے بہت زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو مسلمان آج اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے سرے سے زکوٰۃ نکالنا ہی چھوڑ دیں' اور اگر نکالیں بھی تو اُن کی سہل انگاریوں کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ ضائع ہی ہو جائے۔ بازار میں ایک تنظیم کے زیر اہتمام فروخت ہونے کی صورت میں قربانی کی جس کھال کی قیمت تین چار روپے مل سکتی ہے' بہت ممکن ہے کہ انفرادی طور پر فروخت کرنے کی صورت میں محلّہ کا قصاب اس کے آٹھ آنے پیسے بھی نہ دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی صریح نقصان کو' جس میں زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ پانے والے دونوں شریک ہوں' اسلام کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے زکوٰۃ پانے والوں اور زکوٰۃ دینے والوں دونوں کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اگر اسلامی حکومت باقی نہیں رہی ہے تو جو بھی مذہبی ادارے مسلمانوں کے اندر موجود ہیں وہی ان کاموں کو حتی الامکان سنبھال لیں جو اجتماعی طور پر کرنے کے ہیں۔ جہاں تک دینے والوں کا تعلق ہے' اگر وہ ان پر اعتماد کرتے ہیں تو یہ ادارے بلا اختلاف اُن کے نمائندے اور وکیل ہیں۔ اور جہاں تک غرباء کا

تعلق ہے' ایک ایسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت موجود نہیں ہے' ان کی مثال ایسے یتامیٰ کی ہے جن کا کوئی جائز ولی موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے جو ادارہ بھی ان کے حقوق ان تک پہنچانے اور ان کی خدمت کرنے کی ذمہ داری اٹھالے گا اس کو اس خاص دائرہ کے اندر کامل قسم کی نہ سہی لیکن ایک ناقص قسم کی ولایت تو بہرحال حاصل ہو ہی جائے گی۔

پس یہ بات عقل کے بالکل مطابق اور اسلام کے مزاج کے بالکل موافق معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں وہ پبلک ادارے مسلمانوں کی زکوٰتیں اکٹھی کر کے غرباء کے مصالح پر صرف کریں جن کو پبلک کا اعتماد حاصل ہو۔ کیونکہ یہ صورت اختیار نہ کرنے کی صورت میں جو انتشار رونما ہوگا وہ اغنیاء اور فقراء دونوں کے نقطۂ نظر سے نہایت درجہ نقصان رساں ہے۔ اسی مصلحت کو سامنے رکھ کر مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم نے انگریزی دَور میں مندرجہ ذیل فتویٰ دیا تھا جو میرے نزدیک نہایت گہری دینی مصلحت پر مبنی ہے۔ میں یہ فتویٰ ناظرین کی آگاہی کے لیے یہاں درج کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

''زکوٰۃ وعشر وغیرہ فرائض مالیہ کا وجوب جن حکمِ شرعیہ اور مصالح بشریہ پر مبنی ہے ان کا تقاضا یہ ہے کہ ادائے زکوٰۃ وعشر اور مستحقین پر ان کی تقسیم میں تنظیم کا کامل لحاظ رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ انفرادی تصرفات میں تنظیم مفقود ہوتی ہے۔

اس غلامی کے دَور میں جو تفرق وتشتت کا دَور ہے' امکانی صورت یہی نظر آتی ہے کہ اہل حل وعقد کی کوئی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے''۔ (کتاب العشر والزکوٰۃ' عبدالصمد رحمانی' ص ۱۰۷) (محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ)

مصارفِ زکوٰۃ

اگر مذکورہ تینوں باتیں صحیح مان لی جائیں' یعنی:

ایک یہ کہ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ اس کے حق میں کوئی نص موجود نہیں ہے۔ جو لوگ تملیک کے رکن یا شرط ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو کچھ پیش کرتے ہیں اس کی حیثیت ایک استنباط سے زیادہ نہیں ہے۔ اور محض ایک استنباط اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر تملیک کو زکوٰۃ کا رکن قرار دے دیا جائے۔

دوسری یہ کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل ہوسکتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت اس بات کی پوری طرح مجاز ہے کہ وہ چاہے تو ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں کے مقامی غرباء پر صرف کر دے' چاہے تو کسی خاص علاقہ کی زیادہ شدید ضرورت کی بنا پر وہاں منتقل کر دے' چاہے تو ہر

علاقہ کی زکوٰۃ میں سے مرکز کا ایک حصہ متعین کر دے اور اس کو خاص اپنے اہتمام میں صَرف کرے' اور اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ اپنے اہتمام میں لے کر غرباء کی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر خرچ کرے۔

تیسری یہ کہ ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی حالت میں مسلمانوں کے لیے صحیح صورت زکوٰۃ کے جمع کرنے اور خرچ کرنے کی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے کوئی اجتماعی نظم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح کا کوئی ایک ہی اجتماعی نظم قائم نہ ہو سکے تو پھر ادنیٰ درجہ میں ان کے لیے اسلام کے مزاج سے اور اس پالیسی سے جو اُس نے زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کے بارہ میں پسند کی ہے (قریب تر) یہ بات ہے کہ ان کے مختلف طبقات یا ان کی مختلف جماعتیں جن اسلامی ادارات پر اعتماد کرتی ہیں انہی کو وہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ذریعہ بنائیں' تاکہ ممکن حد تک زکوٰۃ کی افادیت اور غرباء کی بہبود کو ملحوظ رکھا جا سکے۔ غربائے مسلمین کی حقیقی ولی ——— اسلامی حکومت ——— کی عدم موجودگی میں انہی ادارات کو اُن کی ولایت حاصل ہے۔ اور انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ جب تک کوئی بہتر نظم وجود میں نہ آ جائے یہ غرباء کے لیے زکوٰتیں جمع کریں اور اسے غرباء کے مصالح میں صَرف کریں۔

اگر یہ تینوں باتیں اہل علم اور اہل دین کو اپیل کرتی ہیں اور ان کے حق میں جو دلیلیں اوپر بیان ہوئی ہیں وہ کچھ جان دار اور وزنی معلوم ہوتی ہیں تو پھر زکوٰۃ کے مصارف پر ایک وسیع زاویۂ نگاہ سے غور کرنا پڑے گا' اور میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطۂ نظر یہاں اہل علم کے سامنے رکھ دوں تاکہ وہ اس پر غور کر سکیں۔ قرآن مجید میں' جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے' زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین سورۃ التوبۃ کی اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ﴾ (آیت ۶۰)

مَیں اسی آیت کے مختلف اجزاء کی وضاحت کروں گا۔

فقراء اور مساکین

زکوٰۃ کا سب سے پہلا مصرف فقراء اور مساکین کو بتایا گیا ہے۔ یہ ذکر میں تقدیم اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کا حق مقدم ہے۔ یہ دونوں لفظ جب الگ الگ استعمال ہوتے ہیں تو بسا اوقات ایک دوسرے کے ہم معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں' لیکن جب ایک ساتھ آتے ہیں تو استعمالات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک لطیف قسم کا فرق

ہوتا ہے۔ فقیر سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو کمانے' ہاتھ پاؤں مارنے' زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا دم داعیہ تو رکھتے ہیں' لیکن مالی احتیاج ان کے راستہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور مسکین سے وہ طبقہ مراد ہوتا ہے جو مسلسل غربت اور احتیاج کا شکار رہنے کے سبب سے جدوجہد کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اوپر دل شکستگی اور مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا اوّلین مصرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے ان دونوں طبقات کو اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

اس اٹھانے میں جس طرح یہ بات شامل ہو گی کہ ان کی جسمانی ضروریات کھانا' کپڑے اور مسکن فراہم کی جائیں' اسی طرح ان کی عقلی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہو گا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ جس طرح یہ لازمی ہے کہ ان کی وقتی احتیاج رفع کی جائے' اسی طرح یہ بھی غالباً ضروری ہے کہ ان کو مفلسی اور بدحالی کی دلدل سے نکالنے کی مستقل تدبیریں اختیار کی جائیں' تاکہ وہ اپنی ذاتی جدوجہد اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سوسائٹی کے اندر باعزت زندگی بسر کر سکیں اور مستقلاً دوسروں پر بار بنے رہنے کے بجائے دوسروں کے بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر زکوٰۃ کی مد سے ان کے لیے روٹی' کپڑا اور مکان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے' ان کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے بھی کھولے جا سکتے ہیں' ان کے لیے دارالمطالعے اور کتب خانے بھی قائم ہو سکتے ہیں' ایسے صنعتی ادارے بھی ان کے لیے جاری کیے جا سکتے ہیں جن میں ان کے بچے مختلف قسم کی صنعتیں سیکھ کر مستقبل میں اپنے اوپر اعتماد کے قابل بن سکیں۔ اسی طرح ان کے علاج کے لیے ایسے شفاخانے بھی کھولے جا سکتے ہیں جہاں بوقتِ ضرورت ان کو مفت دوا حاصل ہو سکے' جہاں ان کی عورتوں کو ولادت کے موقع پر مفت طبی امداد حاصل ہو سکے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کے مُردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کے زندوں اور مُردوں کے قرضے بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے سارے کام غرباء کے لیے زکوٰۃ کی مد سے کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض صورتوں میں تملیک ہو گی بعض صورتوں میں نہیں ہو گی' لیکن زکوٰۃ کا نفع ہر صورت میں اصلاً غرباء ہی کو پہنچے گا' یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی تملیک بہرحال غرباء ہی کی ہو گی۔

عاملینِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کا دوسرا مصرف زکوٰۃ کے عاملین ہیں۔ اگرچہ یہ زکوٰۃ کے مستحق تبعاً اور ضمناً ہیں'

اصلاً نہیں ہیں' لیکن زکوٰۃ کی تحصیل و وصول میں چونکہ ان کو ایک ناگزیر عامل کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے ان کا ذکر دوسرے ہی نمبر پر آ گیا ہے۔ عاملین سے مراد زکوٰۃ کے وصول کرنے والے کارکن ہیں۔ اس لفظ کے اندر تحصیل دار سے لے کر اس کے پٹواری اور سپاہی تک سب شامل ہیں۔

قال ابن عباس ـــــ ویدخل فی العامل ـــــ الساعی والکاتب والقاسم والحاشر الذی یجمع الاموال وحافظ المال والعریف

(نیل الاوطار' ج ٤' ص ١٨٠)

''عامل کے لفظ کے اندر تحصیل دار' منشی' تقسیم کرنے والا' مال اکٹھا کرنے والا' خزانچی اور کھیا سب شامل ہیں''۔

احادیث اور تاریخ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کمیشن اور اُجرت پر بھی لیا جاتا رہا ہے' اور اس غرض کے لیے وصولیٔ زکوٰۃ کے موسم میں خاص طور پر کارکن بھی بھرتی کیے جاتے رہے ہیں' لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ سامنے لانا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کے اہتمام و انتظام پر جو عملہ مقرر ہوگا اس کے چھوٹے اور بڑے سارے کارکنوں کی تنخواہیں اس سے دی جا سکتی ہیں۔ اس کے آمد و خرچ کے ریکارڈ رکھنے کے لیے جو دفاتر قائم ہوں گے اُن پر بھی اسی مدّ سے لازماً خرچ ہوگا۔ اور جب **عاملین علیها** کے معاوضے اور ان کے دفاتر کے خرچ اس مدّ سے پورے کیے جا سکتے ہیں تو ''**عمل علیها**'' یعنی حمل و نقل' فراہمی اور حفاظت وغیرہ پر' نیز اس سلسلہ کے پروپیگنڈے پر جو کچھ خرچ ہوگا آخر وہ کیوں نہیں اس مدّ سے پورا کیا جا سکتا؟

ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں اگر اسلامی اداروں کو زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے صَرف کا حق حاصل ہے' اور اس عاجز کے نزدیک ان کو یہ حق حاصل ہے' جیسا کہ دلائل کے ساتھ اوپر عرض کیا گیا' تو لازماً یہ حق بھی ان کے لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ زکوٰۃ کے مال اکٹھے کرنے' ان کے حساب کتاب رکھنے' ان کے لانے اور لے جانے' ان کے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے' ان کے مصارف میں ان کے صَرف کرنے پر' نیز اس مقصد کے لیے دعوت و تبلیغ پر جو کچھ وہ خرچ کریں گے وہ سب اس مدّ سے دیا جا سکتا ہے۔

مؤلّفۃ القلوب

ابن کثیر نے مؤلفۃ القلوب کی مندرجہ ذیل قسمیں گنائی ہیں:

۱) ایسے غیر مسلم لیڈر اور سردار جن کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہو

۲) ایسے بااثر نومسلم جن کے اسلام سے پھر جانے کا اندیشہ ہو اور جن کا ارتداد اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہو سکتا ہو۔

۳) ایسے بااثر لیڈر جن کی تالیفِ قلب ان کے ہم چشموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں مددگار ہو سکتی ہو۔

۴) ایسے سردار جو اپنے علاقہ میں اسلامی حکومت کو مالیہ کی وصولی میں مدد دیں اور سرحدی علاقوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر' ج ۲' ص ۳۶۵۔ تفسیر آیۃ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ..... الآیۃ۔)

ایسے نومسلم یا غیر مسلم سردار جن کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے یا جن کو اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لیے صدرِ اوّل میں اسلامی بیت المال سے بھاری بھاری رقمیں دی گئی ہیں' ابنِ جوزی کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس ہیں' جن میں سے چند ایک کے نام امام شوکانی نے نیل الاوطار میں بھی گنائے ہیں جن کو خود نبی ﷺ نے سو سو اونٹ دلوائے۔ ہم یہ نام یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کس کس طرح کے سردارانِ قبائل اور بااثر اشخاص مؤلفۃ القلوب کے زمرہ میں شامل رہے ہیں اور زکوٰۃ کی مدّ سے عطیے پانے کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔

صاحب نیل الاوطار نے جن ناموں کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب' صفوان بن امیہ' عیینہ بن حصن' اقرع بن حابس' عباس بن مرداس' علقمہ بن علاثہ۔

ابن کثیر نے زید الخیر کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو لوگ اس دَور کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو اسلام کی تاثیر سے نہیں بلکہ اسلام کی قوت سے مرعوب ہو کر اس کے مطیع ہوئے تھے' بلکہ ان میں سے صفوان بن اُمیہ کو تو کفر پر باقی رہتے ہوئے حضور ﷺ نے بڑے بڑے عطیے دیے' یہاں تک کہ خود اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ حنین کے موقع پر حضور ﷺ نے مجھے دیا اور اُس وقت میرے نزدیک آپؐ سے زیادہ کوئی دوسرا مبغوض نہ تھا' لیکن آپؐ برابر دیتے رہے' یہاں تک کہ پھر آپؐ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی دوسرا محبوب نہیں رہا۔

مذکورہ ناموں اور مذکورہ مقاصد پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ

خرچ ایک بالکل پولیٹیکل خرچ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جو سیاسی اہمیت اور پولیٹیکل اثر واقتدار رکھتے ہیں' اسلام اور اسلامی حکومت کے حق میں ہموار کیا جائے اور اگر وہ اسلام کے اندر (کسی نوعیت سے سہی) داخل ہو چکے ہیں تو اُن کو اسلام پر مضبوط کیا جائے۔

احناف کے نزدیک اسلام کے غلبہ واقتدار کے نمایاں ہو جانے کے بعد یہ مدّ ساقط ہو گئی' لیکن یہ بات کئی پہلوؤں سے کمزور معلوم ہوتی ہے۔

اوّل تو جس واقعہ سے وہ اس کے سقوط پر استدلال کرتے ہیں اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ایک خاص علاقہ کے سرداروں کو غلبۂ اسلام کے بعد اُن رعایتوں سے محروم کر دیا جو انہیں بطور تالیفِ قلوب کے حاصل تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی علاقہ میں اسلامی حکومت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ اسے اس طرح کے کسی پولیٹیکل خرچ کے سہارا لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو وہ اس کو خواہ مخواہ کیوں جاری رکھے گی؟ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اب کہیں بھی اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے' یا کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی ہے۔

دوم یہ کہ اگر یہ مدّ اس لیے ساقط قرار دی گئی تھی کہ اُس وقت اسلام کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا تو اب اس زوال اور مسلمان حکومتوں کے اس ضعف کے دَور میں اس کو از سرِ نو بحال ہو جانا چاہیے' کیونکہ اس دور میں تو شاید ہی کوئی مسلمان حکومت ایسی ہو جو اپنے حق میں دوسروں کو رام کرنے اور خود اپنوں کو اپنے حق میں ہموار رکھنے کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہو۔

سوم یہ کہ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے' لیکن وہ اس قسم کے پولیٹیکل خرچ سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتی۔ امریکہ اور روس جیسی حکومتیں بھی آج اس بات کی محتاج ہیں کہ دوسروں کو اپنے اور اپنے نصب العین کے حق میں ہموار رکھنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کریں۔ پھر آج اگر ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت قائم ہو تو کس طرح اس چیز سے مستغنی رہ سکے گی؟ البتہ اگر فرق ہو گا تو یہ فرق ہو گا کہ اسلامی حکومت یہ سب کچھ دین حق اور کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے کرے گی' اور یہ حکومتیں یہ سب کچھ کلمۂ کفر کی سربلندی کے لیے کرتی ہیں۔

چنانچہ دوسرے علماء اور ائمہ یہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

ابوعبید کتاب الاموال میں حنفیہ کے نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

واما ما قال الحسن وابن شهاب فعلى ان الامر ماض ابدًا وهذا هو

القول عندی لان الایة محکمة لا نعلم لها ناسخا من کتاب ولا سنة فاذا کان قوم هذه حالهم ' لا رغبة لهم فی الاسلام الا للنیل وکان فی ردّتهم ومحاربتهم ضرر علی الاسلام لما عندهم من الغزو المنعة' فرای الامام ان یرضخ لهم من الصدقة فعل ذالك لخلال ثلاث : احداهن الاخذ بالکتاب والسنة والثانیة البقیا علی المسلمین ' والثالثة انه لیس بیایس منهم ان تماری بهم الاسلام ان یفقهوه وتحسن فیهم رغبتهم (کتاب الاموال' ص ٦٠٧)

''اور یہ جو حسن اور ابن شہاب نے کہا ہے تو انہوں نے یہ پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ یہ حکم ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور یہی قول ہمارا بھی ہے' کیونکہ یہ آیت محکم ہے' قرآن یا سنت سے اس کے منسوخ ہونے کا کوئی ثبوت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ جب ایسے لوگ موجود ہوں جن کا اسلام کی طرف میلان صرف مال کے لیے ہو اور اُن کے ارتداد یا ان سے جنگ کی صورت میں بھی ان کی طاقت وقوت کے سبب سے اسلام کے لیے خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اگر اسلامی حکومت صدقہ کی مد سے ان کی دلجوئی کرے تو تین وجوہ سے وہ ایسا کر سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا کر کے کتاب وسنت کے ایک حکم کی تعمیل کرے گی' دوسری یہ کہ اس میں مسلمانوں کی ہمدردی ہے' تیسری یہ کہ وہ یہ توقع کر سکتی ہے کہ اگر ان لوگوں کو کچھ عرصہ اسی طرح اسلام پر قائم رکھا جا سکا تو کیا عجب وہ اسلام کو سمجھنے لگیں اور دل سے اس کو قبول کر لیں۔''

یہی نقطۂ نظر صاحب نیل الاوطار کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

والظاهر جواز التالیف عند الحاجة الیه ۔ فاذا کان فی زمن الامام قوم لا یطیعونه الا للدنیا ولا یقدر علی ادخالهم تحت طاعته بالقسر والغلب فله ان یتالفهم ولا یکون لفشوّ الاسلام تاثیر لانه لم ینفع فی خصوص هذه الواقعة (نیل الاوطار' ج ٤' ص ١٧٧)

''اور ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ضرورت داعی ہو تو مال کے ذریعہ سے پرچانا جائز ہے۔ اگر حکومت اسلامی کو ایسے لوگوں سے سابقہ ہو جو مال کے بغیر اطاعت کرنے پر راضی نہ ہوں اور جبر وزور کے ذریعہ سے ان کو زیر اطاعت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ مال کے ذریعہ سے ان کی تالیف قلب

کرے۔ اور اسلام کے غلبہ کا اس امر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا' کیونکہ مذکورہ صورت میں تو صاف واضح ہے کہ وہ کچھ مؤثر نہیں ہے۔''

یہی رائے علامہ ابن حزم نے محلّٰی میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وادعی قوم ان سهم المؤلفة قلوبهم قد سقط۔ قال ابو محمد وهذا باطل' بل هم اليوم اكثر ما كانوا وانما يسقطون هم والعاملون اذا تولى المرء قسمة صدقة نفسه لانه ليس هنالك عاملون عليها' وامر المؤلفة الى الامام لا الى غيره (المُحلّٰی' ج٦' ص ١٤٥)

''اور ایک گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد ساقط ہو چکی ہے اور ابو محمد (ابن حزم) کا کہنا یہ ہے کہ آج وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ موجود ہیں۔ مؤلفۃ القلوب اور عاملین کی مدیں تو اُس وقت ساقط ہوں گی جب ہر شخص اپنے صدقہ وزکوٰۃ کی تقسیم کی ذمہ داری خود سنبھال لے' کیونکہ اس صورت میں عاملین سرے سے ہوں گے ہی نہیں اور مؤلفۃ القلوب کا معاملہ تمام تر اسلامی حکومت سے متعلق ہے' افراد سے اس کا تعلق ہی نہیں ہے۔''

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد جس طرح پہلے ضروری تھی اسی طرح اب بھی ضروری ہے اور اس مد پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس طرح ایک اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صدقات اور زکوٰۃ کی آمدنی سے اس خالص پولیٹیکل مقصد پر خرچ کرے' اسی طرح اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں دینی اداروں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے اس کو صرف کریں؟ اس بارہ میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک خالص پولیٹیکل خرچ ہے جس کی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا ایک حکومت ہی کے لیے ممکن ہے۔ اس وجہ سے پبلک اداروں اور انجمنوں کو اپنے تصرفات اسی حد تک محدود رکھنے چاہئیں جس حد تک محدود رکھنے کا انہوں نے اظہار و اعلان کیا ہے' اور جس دائرہ کے اندر خرچ کرنے کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ صرف بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ کی جا سکتی ہیں' مثلاً اگر کسی جگہ کے مسلمان بالکل کفر اور اہل کفر کے زیر اثر آ گئے ہوں اور وہ محسوس کرتے ہوں کہ مال خرچ کر کے بعض مسلمانوں کو کفر کے لیے استعمال ہونے سے بچایا جا سکتا ہے' یا اس کے ذریعہ سے مخالفین کو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی سے روکا جا سکتا ہے' تو اس مقصد کے لیے

زکوٰۃ کے مال میں سے بھی وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

فی الرقاب

فی الرقاب سے مطلب یہ ہے کہ غلاموں کے آزاد کرنے پر بھی زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اب غلامی کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے' لیکن قرآن کے نزول کے وقت یہ مسئلہ موجود تھا۔ اس وجہ سے ایک اہم انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی اعانت اور اُن کی آزادی کو بھی زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف قرار دیا گیا۔

اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کے غلام ہیں یا صرف وہ غلام مراد ہیں جو اپنے آقاؤں سے ایک متعینہ رقم کی ادائیگی کی شرط پر اپنی آزادی کا اقرار حاصل کر لیتے ہیں' جن کو اصطلاح میں مکاتب کہتے ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک اس سے صرف مکاتب مراد ہیں۔ لیکن ابن عباس' حسن بصری' امام مالک' امام احمد بن حنبل' ابوثور' ابوعبید اور امام بخاری وغیرہ کے نزدیک یہ دونوں قسم کے غلاموں کے لیے عام ہے۔ ان کے نزدیک صدقات کی رقم سے ایک غلام کو خرید کر آزاد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے' بلکہ مکاتب کی اعانت کے مقابل میں اولیٰ و افضل ہے۔ (نیل الاوطار' ج ۴' ص ۱۷۸) لیکن احناف اور شوافع کے نزدیک صدقات کی مد سے مکاتب کی اعانت تو کی جا سکتی ہے' لیکن کسی غلام کو مستقلاً خرید کر آزاد نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے اس معاملہ میں امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اوّل تو اس سبب سے کہ اس بحث میں سارا مدارِ سخن ''حرفِ لام'' پر ہے' تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ وہ تملیک ہی کے مفہوم کے لیے خاص ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ ''الرقاب'' پر وہ کہاں داخل ہے؟ یہاں سے تو اب ''فِیْ'' کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جتنے مصارف بیان ہوئے ہیں سب ''فِیْ'' ہی کے تحت ہیں۔ ''فِیْ'' کے متعلق یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر بھی تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر تو جیسا کہ اوپر گزرا' مصلحت' مفاد اور بہبود کا مفہوم پایا جاتا ہے' جس کے معنی یہ ہوئے کہ زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور اُن کو آزاد کرنے کے لیے صَرف کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ تملیک پائی جائے یا نہیں۔ ثانیاً یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ تملیک کا مفہوم ''فِیْ'' کے اندر بھی گھسا ہوا ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ایک غلام کو اُس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیتے ہیں تو اس میں تملیک کیوں نہیں پائی جاتی؟ اگر ایک مسکین کو زکوٰۃ کے پیسوں سے روٹی خرید کر

دے دیں تو اس صورت میں تملیک پائی جائے گی یا نہیں؟ اسی طرح اگر ایک شخص کو ہم اس کی آزادی خرید کے اس کے حوالہ کر دیتے ہیں تو آخر تملیک کیوں نہیں پائی گئی؟ یہ ہم نے اس مفروضہ پر عرض کیا ہے کہ تملیک کا مفہوم ''فِیْ'' کے اندر بھی لے لیا جائے۔ لیکن ہمارے نزدیک' جیسا کہ عرض کیا گیا' یہ صحیح نہیں ہے۔ ''فِیْ'' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کی آزادی کی مہم میں صرف کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مکاتب اپنی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اعانت کا طالب ہے تو آپ اس کو بھی دے سکتے ہیں اور اگر آپ خود کسی غلام کو خرید کر اس کو آزاد کرنا چاہیں تو یہ بھی بے تکلف کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر خدانخواستہ کسی جنگ کے نتیجہ کے طور پر دنیا میں پھر غلامی کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور خدمت انسانیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ایسی انجمنیں قائم ہوں جو اُن غلاموں کی آزادی اور ان کی سود و بہبود کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائیں تو اس تحریک پر بھی صدقات و زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ مستقلاً کسی غلام کو آزاد کرنے کی صورت میں اس کا حق ولا اس کے آزاد کرنے والے کو حاصل ہوگا اور یہ خود اپنی زکوٰۃ سے ایک قسم کے انتفاع کی شکل ہوئی' اس وجہ سے اس کو ناجائز ہونا چاہیے۔ لیکن میرے نزدیک یہ شبہ کچھ وزنی نہیں ہے۔ اوّل تو یہ اعتراض اس صورت میں سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا جبکہ کوئی اسلامی حکومت یا پبلک ادارہ زکوٰۃ کے فنڈ سے کسی غلام کو خرید کر آزاد کرے' کیونکہ اس صورت میں اس آزاد کردہ غلام کا ولا عام مسلمانوں کو حاصل ہوگا جو شخصی انتفاع کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ ثانیاً زکوٰۃ یا اس طرح کی کسی چیز سے وہ شخصی انتفاع ناجائز ہے جس کو پیش نظر رکھ کر ہی زکوٰۃ دی جائے یا وہ کام کیا جائے۔ اگر یہ صورت نہ ہو' بلکہ زکوٰۃ تو دی جائے اس کے اصل مقصد کو سامنے رکھ کر' لیکن اس کے نتیجہ میں زکوٰۃ دینے والے کو کوئی فائدہ حاصل ہو جائے تو اس کے سبب سے اس کا یہ کام ناجائز نہیں ہوگا۔ اگر ایک شخص حج اس لیے کرتا ہے کہ وہ عرب کی سیاحت کرنا چاہتا ہے تو اس کا حج بلاشبہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ حج' حج کے ارادہ سے کرتا ہے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اسے حجاز کی سیاحت کا بھی موقع مل جاتا ہے تو آخر اس سے اس کا حج کیوں باطل ہو جائے گا؟

غارمین

زکوٰۃ و صدقات کا مال ''غارمین'' کی امداد میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ غارمین سے

مراد وہ لوگ ہیں جو کسی کاروباری اتار چڑھاؤ یا حالات کی نامساعدت کے سبب سے قرضے کے نیچے دب گئے ہوں' یا کسی آفتِ ارضی و سماوی نے ان کے گلہ' یا باغ' یا کھیتی' یا سرمایہ یا کاروبار کو تباہ کر دیا ہو' یا انہوں نے اصلاحِ ذات البین کے ارادہ سے دوسروں کی کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو۔

اس طرح کے لوگوں کی امداد اس نقطۂ نظر سے کی جائے گی کہ یہ معاشرہ کے کماؤ اور قابل افراد ہیں' ان کو گرنے اور تباہ ہونے سے بچایا جائے' تاکہ یہ جس چکر میں آ گئے ہیں اس سے نکل کر پھر اپنی صلاحیتوں سے قوم اور معاشرہ کو بہرہ مند کر سکیں۔ ان کی امداد اُن کے فقر یا ان کی مسکنت کی بنا پر نہیں کی جائے گی۔ اگر اس بنا پر کی جانی ہوتی تو ان کا ذکر ایک مستقل عنوان سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' پھر تو یہ فقراء اور مساکین کے زمرہ میں آپ سے آپ آ جاتے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی احتیاج کے ناپنے کا پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہوگا جو فقراء اور مساکین کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں:

> کتب عمر بن عبد العزیز ان اقضوا عن الغارمین فکتب الیه انا نجد الرجل له المسکن والخادم والفرس والاثاث' فکتب عمر انه لابدّ للمرء المسلم من مسکن یسکنه' وخادم یکفیه مهنته' وفرس یجاهد علیه عدوه ومن ان یکون له الاثاث فی بیته نعم فاقضوا عنه (کتاب الاموال' ص ۵۵۶)
>
> ''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو یہ فرمان لکھا کہ زیرباروں کے قرضے ادا کیے جائیں۔ ان کے عمال کی جانب سے ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس مکان موجود ہے' نوکر موجود ہے' گھوڑا موجود ہے' گھر میں فرنیچر اور اثاثہ موجود ہے' کیا ایسے لوگوں کے قرضے بھی اتارے جائیں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ ایک مسلمان کے لیے ایک مکان جس میں وہ رہ سکے' ایک نوکر جو اُس کا ہاتھ بٹا سکے' ایک گھوڑا جس پر وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے اور گھر میں کچھ سروسامان تو ناگزیر چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ہاں' ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کرو۔''

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عمال کو یہ شبہ ہوا تھا کہ غارمین جب تک فقر کی اس حد کو نہ پہنچ جائیں جو فقراء اور مساکین کے لیے مقرر ہے' اُس وقت تک صدقات کی مد سے ان کے قرضے یا ان کی ذمہ داریاں نہیں ادا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن حضرت عمر بن

عبدالعزیز نے اپنے جواب سے یہ بات صاف کر دی کہ اس طبقہ کا صرف فقر دُور کرنا مقصود نہیں ہے' بلکہ اس کو اٹھانا مقصود ہے۔ اس وجہ سے اس کی احتیاج کو اس پیمانہ سے نہ ناپو جس پیمانہ سے فقراء و مساکین کی احتیاج کو ناپتے ہو۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ معدلت گستر میں اپنے عمال کو یہ حکم دیا تھا کہ:

اعطوا من الصدقة من ابقت له السنة غنما ولا تعطوها من ابقت له السنة غنمين (کتاب الاموال' ص ۵۵۸)

''صدقہ کے مال سے ان کی مدد کرو جن کا قحط سے صرف ایک ریوڑ بچ رہا ہو اور ان کی مدد نہ کرو جن کے پاس دو ریوڑ بچ رہے ہوں''۔

روایت میں لفظ ''غنم'' کا ہے۔ غنم سے مراد بکریوں کا ایک ریوڑ ہوتا ہے جو کم و بیش سو بکریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سو بکریاں اس حدِ احتیاج سے بہت زیادہ ہیں جن میں آدمی زکوٰۃ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اتنی بکریوں کی موجودگی میں تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ لیکن اگر قحط یا کسی دوسری آفت کے سبب سے کسی کا گلہ تباہ ہو جائے اور اس کے پاس صرف سو بکریاں بچ رہیں تو وہ بحیثیت ایک غارم کے مستحق ہے کہ حکومتِ اسلامی صدقات کے فنڈ سے اس کو سہارا دے' تاکہ وہ اپنے کاروبار کو سنبھالے رکھ سکے۔

جو شخص محض اس بنا پر غارم کے حکم میں آ جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے آپس کے کسی جھگڑے کو چکانے کی خاطر کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے تو اُس کی غربت و امارت کا تو کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک امیر کبیر ہوتے ہوئے بھی ایک غارم ہے اور مستحق ہے کہ اپنی اُٹھائی ہوئی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صدقات و زکوٰۃ سے امداد پائے۔ امام شوکانی لکھتے ہیں:

''اہل عرب کا حال یہ تھا کہ جب ان کے درمیان کوئی ایسا جھگڑا برپا ہوتا جو دیت وغیرہ کے قسم کے کسی مالی مطالبہ پر مبنی ہوتا تو کوئی شخص اٹھتا اور جھگڑے کو چکانے کے لیے محض للہ فی اللہ اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیتا اور جھگڑا ختم ہو جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چیز مکارمِ اخلاق میں شامل ہے۔ جب لوگوں کو پتا چلتا کہ کسی شخص نے اس طرح کی کوئی ذمہ داری اٹھائی ہے تو اس کی امداد کے لیے سبقت کرتے' یہاں تک کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا۔ اور اگر اس مقصد کی خاطر اُس کو لوگوں سے سوال کرنے کی نوبت آتی تو یہ چیز اس کی عزت میں کوئی کمی نہ کرتی' بلکہ اس کے

لیے وجہ فخر ہوتی۔'' (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۷۹)

بس ایک چیز اس میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ ایک شخص فی الواقع کسی ارضی وسماوی آفت یا کسی واقعی اُتار چڑھاؤ کی زد میں آ کر زیر بار ہوا ہے یا محض اپنی مشیخت اور اپنے اسراف یا اپنے شوقِ قسمت آزمائی کا شکار ہوا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو وہ غارم ہے اور زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد پانے کا مستحق۔ لیکن اگر دوسری صورت ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کم از کم زکوٰۃ و صدقات کی مد سے نہیں کرنی چاہیے ورنہ یہ چیز بہتوں کو غلط راہ پر ڈال دے گی۔

فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ ایک وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاح ہے جس کے اندر نیکی اور بھلائی کے وہ سارے کام داخل ہیں جن کی طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس کی مقابل اصطلاح فی سبیل الطاغوت ہے جس سے مراد وہ پورا نظامِ ضلالت ہے جو شیطان نے بچھا رکھا ہے۔ اس تقابل کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ سبیل اللہ سے مراد وہ پورا نظامِ ہدایت بحیثیتِ مجموعی بھی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اس کے الگ الگ اجزاء بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ اگر بحیثیتِ مجموعی اس پورے نظام کے قیام و بقاء اور اس کی حفاظت اور اس کے استحکام پر صدقات و زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جائے جب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور اگر اس کے کسی ایک ہی جزو کی حفاظت و ترقی پر اس کو صرف کیجیے جب بھی وہ فی سبیل اللہ ہے۔

انفاق اور جہاد بالمال کے تعلق کے ساتھ جہاں جہاں فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے ہم اس کی بعض مثالیں یہاں قرآن مجید سے نقل کرتے ہیں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ اس اصطلاح کے تحت کیا کیا چیزیں آ سکتی ہیں۔

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد بالسیف ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور خانہ کعبہ کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے جاری تھا۔

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ.....﴾ (البقرۃ:۲۶۱)

''ان لوگوں کے خرچ کی مثال جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ایسی ہے جیسے ایک دانہ اگائے سات بالیاں.....''

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد عام مصارفِ خیر ہیں جن میں نیکی اور بھلائی کے سارے کام داخل ہیں۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی .....﴾ (البقرۃ:۲۶۲)

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کے راستہ میں اور اس خرچ کے پیچھے اظہارِ احسان اور ایذا کی بلا نہیں لگا دیتے.....''

مذکورہ آیت میں بھی فی سبیل اللہ سے فقراء اور مساکین اور اس طرح کے دوسرے مستحقین مراد ہیں۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ﴾ (البقرۃ:۲۷۳)

''ان فقراء کے لیے خرچ کیا جائے جو اللہ کی راہ میں بند ھ گئے ہیں اور زمین میں ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتے''۔

اس آیت میں سیاقِ کلام سے واضح ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد دین اور علمِ دین مراد ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ (الانفال:۳۶)

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں''۔

یہاں سبیل اللہ سے مراد اسلام بحیثیت مجموعی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ.....﴾ (الانفال:۷۲)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے' جنہوں نے ہجرت کی اور جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا.....''

یہاں فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے مراد اقامتِ دین کی جدوجہد بحیثیتِ مجموعی ہے۔

اسی طرح ابوداؤد کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ میں شامل ہے۔ فان الحج من سبیل اللہ۔

مذکورہ بالا استعمالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اندر نیکی اور خیر کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اگر یہ لفظ تنہا بولا جائے تو اس سے خیر کا کوئی خاص کام بھی مراد ہوسکتا ہے اگر موقع کلام کسی خاص چیز کو متعین کردے اور پورا دین بھی اس سے مراد ہوسکتا ہے اگر موقع عمومیت کا ہو۔ اور اگر نیکی اور بھلائی کے چند متعین کاموں کے ساتھ اس کا ذکر آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان خاص خاص کاموں کے بعد اس جامع اصطلاح نے بقیہ دوسرے دین کے سارے کاموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے بعینہٖ یہی بات دوسرے محقق علماء نے بھی لکھی ہے۔

علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر روح المعانی میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کے تحت حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قیل المراد طلبة العلم واقتصر علیه فی الفتاوی الظهیریة وفسره فی البدائع بجمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة الله تعالیٰ وسبل الخیرات (تفسیر روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۱۰)

''کہا گیا ہے کہ اس سے مراد طالب علم ہیں اور فتاوی ظہیریہ میں اس مد کو طلبہ ہی تک محدود کردیا گیا ہے۔ لیکن ''بدائع الصنائع'' میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ اس میں نیکی اور قرب الٰہی کے سارے ہی کام داخل ہیں، تو جو شخص بھی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے کاموں میں جدوجہد کرے گا وہ اس میں شامل ہوگا۔''

ابن عربی احکام القرآن میں امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال مالك سبل الله كثيرة ۔ احمد واسحاق قالا انه الحج والذی یصح عندی من قولهما ان الحج من جملة السبل مع الغزو

''فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد اور اسحٰق کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حج ہے، لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح منشا یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے''۔

تفسیر کبیر اور تفسیر خازن میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ قول ملاحظہ فرمائیے:

واعلم ان ظاهر اللفظ فی قوله وفی سبیل الله لا یوجب القصر علی

الغزاة فلهذا المعنى نقل القفال فى تفسيره عن بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الى جميع وجوه الخير من تكفين الموتى او بناء الحصون وعمارة المساجد لان قوله وفى سبيل الله عام فى الكل (تفسیر کبیر' ج ٤' ص ٤٦٤ و خازن' ج ٢' ص ٣٠٧)

''فی سبیل اللہ کے ظاہر الفاظ اس بات کو لازم نہیں کرتے کہ اس مد کو تمام تر مجاہدین کے لیے خاص کر دیا جائے۔ اسی وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ وہ صدقات کو تمام مصارفِ خیر' مثلاً مُردوں کی تجہیز و تکفین' قلعوں کی تعمیر' مساجد کی تعمیر پر خرچ کرنا جائز قرار دیتے ہیں' کیونکہ فی سبیل اللہ کے الفاظ ان تمام چیزوں پر حاوی ہیں۔''

علامہ ابن حزم محلّٰی میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ فرماتے ہیں:

قلنا نعم وكل فعل خير فهو من سبيل الله تعالى (المحلى' ج ٦' ص ١٥١)

''ہم کہتے ہیں ہاں' نیکی اور بھلائی کا ہر کام فی سبیل اللہ کے تحت داخل ہے۔''

اس دورِ آخر کے مشہور سلفی عالم علامہ رشید رضا مرحوم اپنی تفسیر المنار میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفى سبيل الله وهو يشتمل سائر المصالح الشرعية العامة هى ملاك امر الدين والدولة واولها واولاها بالتقديم الاستعداد للحرب بشرأ السلاح واغذية الجند ولدوات النقل وتجهيز الغزاة وتقدم مثله عن محمد بن الحكم (تفسیر المنار' ج ١٠' ص ٥٠٥)

''فی سبیل اللہ کے الفاظ ان تمام شرعی مصالح پر مشتمل ہیں جن پر مذہب اور حکومت کا انحصار ہے۔ ان میں سب سے اوّل اور سب پر مقدم یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے لیے اسلحے خریدے جائیں' فوج کے لیے غذائی سامان فراہم کیا جائے' ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے' مجاہدین کو سامانِ حرب سے لیس کیا جائے۔ اسی طرح کا قول محمد بن حکم سے مروی ہے۔''

ہمارے ملک کے بلند پایہ عالم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں فی سبیل اللہ کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں:

''فی سبیل اللہ کا وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے''۔

(سیرت' ج ٥' ص ١٧٦)

مذکورۂ بالا اقوال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اسلام کی دینی و دنیاوی مصلحت کی کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو اس کے اندر سمٹ نہ آئی ہو۔ اس میں کسی پہلو سے تملیک کا بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ اوّل تو یہاں کوئی چیز ایسی ہے نہیں جس سے تملیک کا مفہوم اخذ کیا جا سکے' لے دے کر ایک ''لام'' تھا' لیکن اس کی جگہ پر بھی جیسا کہ عرض کیا گیا' یہاں ''فِیْ'' ہے جس کے اندر تملیک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ثانیاً اگر اس کے تحت تمام مصارفِ خیر آتے ہیں' جیسا کہ ہر مسلک کے علماء اور ائمہ نے تصریح کی ہے' تو تملیکِ شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تملیکِ اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردّد ہے کہ ''لِلْفُقَرَاءِ'' کی ''لام'' کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑیئے' یہ دیکھئے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مد کے تحت آتی ہے یا نہیں؟ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔

ابن السبیل

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافرت بجائے خود ایک ایسی حالت ہے جو بجا طور پر آدمی کو مدد کی محتاج اور مستحق بنا دیتی ہے۔ ایک اوسط درجہ کا آدمی بھی جو اپنے شہر میں ایک کھاتا پیتا آدمی شمار ہوتا ہے' اگر کسی سفر پر مجبور ہو جائے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ ہر جگہ اپنی ساری ضروریات خود پوری کر سکے۔ یہ تو صرف تھوڑے سے مال داروں ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ جہاں بھی جائیں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھہریں' ٹیکسیوں میں گشت کریں اور اگر بیمار پڑ جائیں تو اپنے مستقر ہی پر ڈاکٹر بلا کر علاج کرائیں۔ ایک عام آدمی' اگرچہ وہ محتاج اور فقیر کی تعریف میں نہ آتا ہو' سفر میں اپنی ساری ضروریات اگر خود اپنی جیب کے بل پر پوری کرنی چاہے تو یہ اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ وہ تو بہرحال مجبور ہوگا کہ اگر رات گزارنی ہو تو کسی مسافر خانہ یا سرائے کا پتا معلوم کرے' اگر بیمار ہو جائے تو کسی خیراتی شفاخانہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے اور اگر ٹرانسپورٹ کا کوئی رعایتی یا مفت ذریعہ ہاتھ آ جائے تو اس سے فائدہ اٹھائے۔ اگر وہ یہ کچھ نہ کرے گا تو اس کے لیے کسی لمبے سفر کے مصارف کا بار اٹھانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کو عام معنوں میں محتاج نہ ہونے کے باوجود صدقات و زکوٰۃ سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے۔ ابن کثیر نے ابوداؤد کے حوالہ سے یہ

روایت نقل کی ہے:

قال رسول اللّٰہ ﷺ :((لا تحل الصدقة لغنی الا فی سبیل اللہ وابن السبیل او جار فقیر فیهدی لك او یدعوك)) (ابن کثیر' ج ۲' ص ۳۶۶)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی غنی کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے مگر تین صورتوں میں: وہ اللہ کی راہ میں ہو' یا مسافر ہو' یا کوئی غریب پڑوسی ہو جو صدقہ کے مال میں سے تمہارے لیے ہدیہ بھیجے یا کھانے پر بلائے''۔

اس وجہ سے یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ صرف انہی مسافروں کو صدقات سے استفادہ کا مستحق سمجھا جائے جن کا کرایہ ٹھہر گیا ہو یا جن کا اونٹ مر گیا ہو' بلکہ عام مسافروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ بلکہ تملیک شخصی کی پابندی نہ باقی رہنے کی صورت میں تو بہتر شکل مسافروں کو فائدہ پہنچانے کی یہ ہے کہ تمام ایسی مرکزی جگہوں پر جہاں ہر طبقہ کے مسلمان جمع ہونے پر مجبور ہوتے ہوں اور تمام ایسے شہروں میں جن میں عموماً باہر کے مسلمان آمد و رفت رکھتے ہوں' مسافروں کی سہولت اور آسائش کے لیے مسافر خانے اور رباطیں بنائی جائیں' جہاں اس امر کا بھی اہتمام ہو کہ ان کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے ضروری معلومات فراہم کی جا سکیں' ان کی ڈاک اور تار کا اہتمام ہو' اور ضرورت کے مطابق ان کے لیے طبی امداد بھی بہم پہنچ سکے۔ مکہ' مدینہ' منیٰ اور جدہ میں جتنی اس کی ضرورت ہے اس سے قطع نظر کیا کراچی' لاہور' پشاور اور اس طرح کے دوسرے شہروں میں مسافروں کے لیے اس طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسافر بسا اوقات اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں؟ لیکن ہمارے کسی شہر میں بھی ایسے ادارے موجود نہیں ہیں جو مسافروں کو ان کی مطلوبہ سہولتیں بہم پہنچانے کے ذمہ دار ہوں۔

ابوعبید نے کتاب الاموال میں انسؓ بن مالک اور حسن بصری کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

قالا ما اعطیتَ فی الجسور والطرق فهی صدقة ماضیة

(کتاب الاموال' ص ۵۷۴)

''ان دونوں کا یہ قول ہے کہ پلوں اور راستوں کی تعمیر میں جو کچھ تم نے دیا وہ بھی صدقہ ادا شدہ ہے''۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں نے اس کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کیا ہو' لیکن بالکل مساوی ہی

درجہ کا ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ اس کو ابن السبیل کے تحت لائے ہوں۔

قربانی کی کھالوں کا شرعی حکم

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صدقات و زکوٰۃ کی معروف اقسام کو پیش نظر رکھ کر عرض کیا گیا ہے' لیکن خاص قربانی کی کھالوں سے متعلق ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے' وہ یہ کہ کیا ان کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو عام صدقات و زکوٰۃ کی ہے یا ان سے کچھ مختلف ہے؟ بعض واضح دلائل کی بنا پر اس عاجز کا رجحان یہ ہے کہ ان کی نوعیت صدقات و زکوٰۃ کی معروف اقسام سے بالکل مختلف ہے۔

اس اختلاف کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کی عام طور پر جو تعریف کی جاتی ہے اس کا کوئی جزو بھی اس کے اوپر صادق نہیں آتا۔

زکوٰۃ کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے:

''نصاب مقررہ کا کوئی حصہ کسی فقیر یا اس طرح کے کسی ایسے آدمی کو دینا جس کو دیے جانے میں کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو اور یہ دینا اس طرح ہو کہ عطا کردہ مال سے دینے والے کا کوئی مفاد وابستہ نہ رہے۔''

اب آیئے دیکھئے کہ اس کا کوئی جزو بھی قربانی کی کھالوں پر صادق آتا ہے؟

قربانی کی کھالیں نصاب کا کوئی جزو نہیں ہیں۔ ان کو لازماً کسی فقیر ہی کو دینا ضروری نہیں ہے۔ آپ خود بھی اپنی قربانی کی کھال اپنے کسی ذاتی مصرف میں لا سکتے ہیں' اپنے کسی دوست کو دے سکتے ہیں' کسی غریب اور محتاج کو دے سکتے ہیں' بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر سکتے ہیں' بس اگر ممانعت ہے تو اس بات کی ہے کہ بیچ کر اس کے دام کھرے کرنے کی فکر نہ کیجیے۔

اس کے دینے میں کسی ہاشمی یا غیر ہاشمی کے امتیاز کی کوئی وجہ بھی بظاہر نظر نہیں آتی' کیونکہ اس کے اوپر ''لوگوں کے مال کا میل'' ہونے کی تعبیر کسی طرح بھی صادق نہیں آتی۔ دینے والے کا اپنا مفاد بھی اس سے منقطع ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی قربانی کی کھال کی جانماز بنا کر محلہ کی مسجد پر وقف کر دے تو اس پر وہ خود بھی نماز پڑھ سکتا ہے اور دوسرے مسلمان بھی اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اب میں مختصراً قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں سے مذکورہ باتوں کی دلیلیں نقل کرتا ہوں۔

جہاں تک قربانی کے گوشت کا تعلق ہے' اس کا ذکر تو خود قرآن ہی میں موجود ہے کہ اس

کو کھاؤ' کھلاؤ اور غریبوں کو دو۔

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ (الحج)

''پھر اس میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ فقیر کو بھی کھلاؤ۔''

اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ یہ نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے کہ اس میں فقیر کو دینے کا ذکر ''اٰتُوْا'' یا ''تَصَدَّقُوْا'' کے الفاظ کے ساتھ نہیں آیا ہے' بلکہ ''اَطْعِمُوْا'' کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ اِیتاء اور تَصَدّق کے الفاظ تملیک شخصی کے مفہوم کے لیے آتے ہیں' جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے' تو کیا ''اطعام'' کا لفظ بھی تملیکِ شخصی کے مفہوم کا حامل ہے؟ اگر ایک شخص اپنا قربانی کا گوشت پکا کر بہت سے غریبوں کو بلا کر ایک دعوتِ عام کی صورت میں کھلا دے تو کیا یہ اطعام نہ ہوگا؟ حالانکہ ''فتح القدیر'' کی تصریح کے مطابق اس صورت میں تملیک نہیں پائی گئی جس کو صدقات و زکوٰۃ کی شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔

جو حکم قربانی کے گوشت کا ہے' احادیث اور فقہاء کی تصریحات سے ثابت ہے کہ بعینہٖ وہی حکم قربانی کی کھالوں کا بھی ہے۔ یعنی ایک شخص اپنی قربانی کی کھال خود اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لا سکتا ہے' کسی کو ہبہ بھی کر سکتا ہے اور کسی محتاج اور غریب کو صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ بس یہ بات ناجائز ہے کہ خصیوں اور لیکموں کی طرح اس کو بیچ کر سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ قتادہ بن نعمان سے روایت ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام فقال: ((انی کنت امرتکم ان لا تاکلوا لحوم الاضاحی فوق ثلاثۃ ایام لیسعکم' وانی احلہ لکم فکلوا ما شئتم ولا تبیعوا لحوم الھدی والاضاحی وکلوا وتصدقوا واستمتعوا بجلودھا ولا تبیعوھا)) (نیل الاوطار' ج ۵' ص ۱۳۷)

نبی ﷺ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے خطبہ دیا کہ ''میں نے تم کو یہ حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھ چھوڑا کرو' یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ تم سب کے لیے کافی ہو سکے۔ اب میں اس کو تمہارے لیے جائز کرتا ہوں۔ پس تم اس کو جس طرح چاہو برتو' البتہ ہدی یا قربانی کا گوشت بیچو نہیں۔ کھاؤ' خیرات کرو اور ان کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ' البتہ ان کو بیچو نہیں۔''

اس حدیث سے واضح ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھال کے مصرف میں کوئی

خاص فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے تو اس کو اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لا سکتا ہے' لیکن اس کو سرمایہ بنانے کا ذریعہ نہ بنائے' بلکہ اس کو صدقہ کر دے۔ فقہاء کی تصریحات بھی اس کے متعلق یہی ہیں۔

امام شوکانیؒ مذکورہ حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

وفیہ ایضاً الاذن بالانتفاع بھا بغیر البیع وقد روی عن محمد بن الحسن ان لہ ان یشتری بمسکھا غربالا او غیرھا من آلة البیت لا شیئا من المأکول ۔ وقال الثوری لا یبیعہ ولکن یجعلہ سقاً وشناً فی البیت (نیل الاوطار' ج۵' ص ۱۳۸)

''اور اس حدیث سے بیچے بغیر ان کھالوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نکلتی ہے۔ محمد ابن حسن سے مروی ہے کہ اس کھال کے بدلہ میں آدمی گھر کے لیے چھلنی یا اس طرح کی گھریلو چیزوں میں سے کوئی چیز حاصل کر سکتا ہے' البتہ کھانے پینے کی کوئی چیز اس کے بدلہ میں نہ حاصل کرے۔ امام ثوری کہتے ہیں کہ اس کو بیچے نہیں' گھر کے لیے ڈول یا مشکیزہ بنالے''۔

حنفی فقہاء کی تصریحات اس بارہ میں یہ ہیں:

ولما جاز الاکل منھا دل علی جواز الانتفاع بجلودھا من غیر جھة البیع ولذالك قال اصحابنا یجوز الانتفاع بجلد الاضحیة وروی ذالك عن عمر وابن عباس وعائشة وقال الشعبی کان مسروق یتخذ مسك اضحیتہ مصلی ویصلی علیہ

(احکام القرآن' ابوبکر جصاص' ج۳' ص ۲۹۳)

''جب قربانی کا گوشت کھانا جائز ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کھالوں سے آدمی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ اس کو بیچ کر اس سے سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء کا مذہب یہ ہے کہ قربانی کی کھال سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ یہی بات حضرات عمرؓ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ ؓ سے بھی مروی ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ مسروق اپنی قربانی کی کھال کی جانماز بنالیا کرتے اور اس پر نماز پڑھا کرتے''۔

غور فرمایئے کہ زکوٰۃ وصدقات کی تمام معروف اقسام میں سے ہے کوئی قسم ایسی جس میں آدمی کے لیے یہ سارے تصرفات جائز ہوں کہ وہ اس سے خود بھی فائدہ اٹھا سکے اور

بلا امتیاز امیر و غریب' سید و غیر سید' کسی دوسرے کو بھی دے سکے اور اس کو صدقہ بھی کر سکے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو آخر یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ ساری شرطیں جو صدقاتِ واجبہ کے لیے مقرر ہیں وہ اس پر بھی لاکر چسپاں کر دی جائیں؟ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے فرض کیا کہ تملیک ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن کیا قربانی کی کھال زکوٰۃ اور صدقہ ہے کہ اس پر سارے احکام صدقہ اور زکوٰۃ کے عائد کیے جائیں؟

میں نے تو مذکورۂ بالا احادیث و اقوال کی روشنی میں جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھالوں کا معاملہ صدقات و زکوٰۃ کے سلسلہ سے تعلق رکھنے کے بجائے مکارمِ اخلاق' فیاضی اور احسان و تبرع سے تعلق رکھتا ہے۔ آدمی ان کو کھائے' کھلائے' خود برتے اور دوسروں کو ہدیے' تحفے اور صدقے کے طور پر دے۔ بس ان کو سینت کر رکھنے یا بیچ کر سرمایہ بنانے کی فکر نہ کرے۔ غرباء اور محتاجوں کو اس میں سے پوری فیاضی کے ساتھ دے' بلکہ فضیلت یہی ہے کہ اگر خود ضرورت محسوس نہیں کرتا تو سب کچھ صدقہ کر دے' جیسا کہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے:

عن علی بن ابی طالب قال امرنی رسول اللہ ﷺ ان اقوم علی بدنہ وان اتصدق بلحومھا وجلودھا واجلتھا (نیل الاوطار' ج ۵' ص ۱۳۷)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ آپ کے قربانی کے اونٹوں کی قربانی کراؤں اور ان کے گوشت' ان کی کھالیں یہاں تک کہ ان کے جھول سب صدقہ کر دوں۔''

اس کی نوعیت عام صدقات و زکوٰۃ کی نہیں ہے کہ آدمی خود کسی نوعیت سے بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا یا ان کے اندر اس کا تصرف مخصوص قواعد و ضوابط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ بلاشبہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اگر کسی انجمن یا ادارہ کی خدمات کو غرباء کے لیے مفید پا رہا ہے تو اس کو بے تکلف دے سکتا ہے۔ اس میں کسی تملیک کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اپنے علم کی حد تک میں نے صحیح دلائل سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ حرف حرف ٹھیک ہی ہے۔ اس وجہ سے میں یہ ذمہ داری کے خلاف سمجھتا ہوں کہ اس کو ایک

(باقی صفحہ 33 پر)

''مصارفِ زکوٰۃ''
استفتاء اور جواب

سوالات:

۱) مصارفِ زکوٰۃ میں سے ''فی سبیل اللہ'' سے کیا مراد ہے؟

۲) کیا زکوٰۃ کی رقم کسی ایسے ادارے کو دینا درست ہے جہاں زکوٰۃ کو عام دینی مقاصد میں استعمال کیا جاتا ہو؟

۳) کیا مصارفِ زکوٰۃ کے لیے 'تملیک' شرط لازم ہے؟ اگر کسی ادارے میں تملیک کے بغیر فی سبیل اللہ کی مد میں رقم وصول کی جاتی ہو تو کیا زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

(نوٹ: مختار حسین فاروقی صاحب کا مضمون اور انجینئر نوید احمد صاحب کا کتابچہ منسلک ہے)

بسم اللہ جواب:

الجواب بعون الملک الوھاب

واضح رہے کہ سلفِ اُمت کے متفقہ مسائل سے انکار، ائمہ سابقین کی اجتماعی تحقیقات سے انکار کرنا زمانہ حال کے ''نئے محققین'' اور نئی روشنی کے ''مجتہدین'' کا فیشن سا ہو گیا ہے۔ اس مہلک علمی بیماری کا (جو اَب روز بروز عام ہوتی جارہی ہے) سب سے بڑا اور خطرناک ضرر یہ ہے کہ اس نے دین کے علمی نظام کے بہت بڑے حصے کے متعلق ناواقفوں کے ایک وسیع طبقہ کو سخت شکوک وشبہات میں مبتلا کر کے بہت سے مسلّمہ مسائل پر بھی از سرِ نو بحث واستدلال کی ضرورت پیدا کر دی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی زیر بحث مسئلہ بھی ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے قرآن وسنت کے ذریعہ ہمیں عبادات کا مکمل اور جامع نظام عطا فرمایا ہے۔ اسی عبادات کی ایک اہم کڑی زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم مالی فریضہ ہے۔ زکوٰۃ کی اہمیت کی وجہ سے قرآن پاک میں بار بار نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کی

فرضیت اسلام کی اُن قطعی اور بدیہی تعلیمات میں سے ہے جس کا انکار کرنے سے مسلمان دائرۂ اسلام سے باہر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے جہاد کا حکم فرمایا اور جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔

زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور سے باقاعدگی کے ساتھ قائم کیا گیا۔ زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہوتی ہے؟ کن لوگوں پر واجب ہوتی ہے؟ مختلف قسم کے مالوں میں زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ اس طرح کے بہت سے سوالوں کے جوابات صراحتاً کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ چونکہ نظامِ زکوٰۃ کا قیام مسلمانوں کی اہم ترین انفرادی واجتماعی ضرورت تھی اس لیے زکوٰۃ کے مسائل اور اس کی ادنیٰ تفصیلات پر فقہاء، محدثین اور مفسرین نے سیر حاصل بحثیں کیں اور اس کا کوئی پہلو تشنۂ بحث نہیں چھوڑا کہ جس کے لیے ان کی تحقیقات کو رد کر کے آج ہم کو کسی نئے اجتہاد کی ضرورت پڑے۔

زکوٰۃ کن لوگوں پر صرف کی جائے؟ مصارفِ زکوٰۃ کیا ہیں؟ اس کی وضاحت وتفصیل خود اللہ رب العزت نے سورۃ التوبۃ میں حصر کے ساتھ بیان فرما دی ہے، پھر مصارفِ زکوٰۃ بیان کرنے کے بعد اس کی اہمیت کو ﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ کہہ کر مؤکد کر دیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم صرف انہی لوگوں کو دی جا سکتی ہے جس کا تذکرہ اللہ رب العزت نے کیا ہے۔ مصارفِ زکوٰۃ کے باب میں سورۃ التوبۃ کی آیت ۶۰:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ..... الآية﴾

کی بنیادی حیثیت ہے۔

آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فاحكم الله عزوجل فرض الزكوة في كتابه ثم اكّدها فقال فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰه وليس لاحد ان يقسمها على غير ما قسمه الله عزوجل ذلك ما كانت الاصناف موجودة" (کتاب الام، ج۲، ص ۶۰)

ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولا يجوز صرف الزكوة الى غير من ذكر الله تعالى"

(المغنی، ج۲، ص ۵۲۷)

غرض یہ کہ مصارفِ زکوٰۃ کتاب اللہ سے منصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں تبدیل و

ترمیم کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں دیا' نہ ہی کسی فقیہہ کو کہ وہ زمانہ اور حالات کی رعایت کر کے ان کے اندر اضافہ یا کسی قسم کی ترمیم کرے۔ تو عام آدمی کو کیا اختیار ہوگا؟

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ دے دیجیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان اللّٰہ لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ فی الصدقات حتی حکم فیھا ھو فجزائھا ثمانیۃ اجزاء فان کنت من تلك الاجزاء اعطیتك حقك))

(ابوداود' ج ۱' ص ۲۳۰)

''صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حوالہ نہیں کیا' بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصارف متعین فرمائے۔ اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں تمہارا حق دے دوں گا''۔

لہٰذا نہ تو کسی غیر مصرف زکوٰۃ کو مصرف قرار دے کر اسے مستحقِ زکوٰۃ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی مصرف کو زکوٰۃ کی مد سے خارج کیا جا سکتا ہے۔

عہد نبویؐ سے لے کر عہدِ حاضر تک پوری اُمت مسلمہ زکوٰۃ اور دیگر صدقاتِ واجبہ کی رقوم قرآن کے بیان کیے ہوئے مصارف پر خرچ کرتی رہی (جن کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہیں) اور کر رہی ہے۔

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں زکوٰۃ کا ساتواں مصرف ''فی سبیل اللہ'' ہے۔

حاملانِ دین کے وہ اکثر طبقے جن کی وساطت سے علم دین کی امانت ہم تک پہنچی' یعنی فقہاء' مجتہدین' محدثین ومفسرین' سب اس کے قائل ہیں کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد راہِ خدا میں جہاد وقتال کرنے والے لوگ ہیں۔ چند ایک کے اختلاف کے باوجود (جنہوں نے اس میں حاجیوں کو بھی شامل کیا ہے) اس پر ائمہ اُمت کا اتفاق اور اجماع رہا ہے۔ احادیث صحیحہ اور آثارِ صحابہ وتابعین سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ (جس کی تفصیلات و دلائل کا آگے ذکر ہوگا)۔

تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں دیگر فاسد رجحانات کی طرح یہ رجحان بھی پروان چڑھا کہ احادیث وآثار اور متقدمین کی تفاسیر سے قطع نظر صرف لغت اور عربی ادب کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کی جائے۔ اگرچہ تفسیر کے سلسلے میں یہ منحرف رجحان بعض گمراہ فرقوں میں ماضی میں بھی موجود تھا' لیکن انیسویں صدی میں زور پکڑنے والی مغربی عقلیت نے اس

مُردہ رجحان کو نئی زندگی بخشی۔ مغربی فکر و فلسفہ کی سحر انگیزی کے زمانہ میں بیسویں صدی کے بعض قابل قدر مفسرین بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض معاصر علماء اور بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات بڑے زور و شور سے اٹھائی جا رہی ہے کہ قرآن کے لفظ ''فی سبیل اللہ'' میں توسیع و تعمیم ہے۔ ''فی سبیل اللہ'' کے مصداق و مراد کی تحقیق محض لغت و ادب کے ذریعہ کی جانے لگی اور اس سلسلے میں اُمت کے اجماعی موقف کو ترک کرنے کی دعوت دی جانے لگی۔ بقول ان کے اس میں بلا کسی قید کے ہر وہ شخص داخل ہے جو کسی بھی رفاہی اور دینی کام میں مشغول ہو' اسی طرح ہر وہ تحریک' تنظیم' اکیڈمی یا انجمن یا تصنیفی مراکز جو کسی نہ کسی درجہ میں دین و ملت کی خدمت میں' اس کی نشر و اشاعت میں مشغول ہوں' وہ بھی ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق ہیں اور اس مصرف میں شامل ہیں اور مستحق زکوٰۃ ہیں' ان کو زکوٰۃ کی رقم دینا اور ان کے لیے لینا جائز ہے۔

چونکہ اس لحاظ سے یہ نقطۂ نظر بڑا نازک ہے کہ اگر اس طرح کی تنظیمیں' انجمنیں یا ہر رفاہی کام میں مشغول افراد ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہیں تو آج تک اُمت ان لوگوں کو زکوٰۃ سے کیوں محروم کرتی رہی؟ اور اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں تو پھر نص قرآنی کی رو سے انہیں زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے اس مصرف ''فی سبیل اللہ'' کا جائزہ لیا جائے۔

چنانچہ اسی سلسلے میں زیر نظر صفحات میں اوّلاً بنیادی طور پر اسی مصرف کے متعلق تحقیق ہو گی کہ ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق کیا ہے؟ اس سلسلے میں جمہور علماء اور اکابر اُمت کی تشریحات کیا ہیں؟ کیا اب تک ''فی سبیل اللہ'' کا مفہوم متعین نہیں ہوا کہ جس کے لیے ہمیں کسی نئے اجتہاد سے کام لینا پڑے۔ اور آخر میں اجتہاد پر مختصر کلام کیا جائے گا جس پر اس سارے مضمون کی عمارت کھڑی ہے کہ جس میں مضمون نگار نے زکوٰۃ کے مصرف ''فی سبیل اللہ'' کو عام کر دینے کی پُرزور وکالت کرتے ہوئے از سر نو جدید اجتہاد کرنے کو بنیاد بنایا ہے۔ نیز انہوں نے صرف اپنی ''تحقیق'' پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علماء' مفتیانِ کرام' اربابِ مدارس کو مشورہ دیا ہے کہ ان گزارشات کی روشنی میں حکمت سے کام لیتے ہوئے اپنے فتاویٰ میں تبدیلی اور اصلاح کر لیں' یعنی ''فی سبیل اللہ'' کے عام ہونے اور تملیک کی شرط ختم ہونے کا فتویٰ دیں۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں ہونی چاہئے کہ زیر بحث مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ

اس کا تعلق آیاتِ احکام میں سے ایک آیت کے بعض الفاظ کی تفسیر وتشریح سے ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے قدیم مفسرین' فقہاء' محدثین کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ انہوں نے سورۃ التوبۃ کی مذکورہ آیت میں ''فی سبیل اللہ'' سے کیا مراد لیا؟ احادیث رسولؐ آثارِ صحابہ و تابعین سے صراحتاً یا اشارتاً مصارفِ زکوٰۃ میں ''فی سبیل اللہ'' کا کیا معنی متعین ہوتا ہے؟

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سابقہ مفسرین کی تفسیر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے' کیونکہ قرآن کریم کی آیات کی وہی تفسیر شرعاً معتبر ہے جو خود صاحبِ وحی ﷺ سے منقول ہو یا آپؐ کے صحابہ یا ائمہ سلف سے منقول ہو۔ یہ حضرات کتاب اللہ کے معانی' اس کی تفسیر' منشاء خداوندی کو بعد میں آنے والے لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ ان کے علم میں گہرائی اور رسوخ تھا اور وہ زہد وورع کے پیکر اور خوبِ خدا سے ان کے قلوب معمور تھے۔ اس لیے سلف صالحین اور قرونِ اولیٰ کی تشریحات اور تفسیری روایات کو نظرانداز کر کے کوئی دوسرا قول اختیار کرنا بڑی جسارت کی بات ہے۔ کسی کلام کی تشریح میں جب کہ صاحبِ کلام اور اس کے خاص اصحاب وشاگردوں کی تصریحات موجود ہوں' تو اس میں ''اجتہاد'' کے نام پر مزید یا جدید کا اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کی اجازت دی جائے کہ ہر کوئی ائمہ سلف اور حضراتِ صحابہؓ کی تفسیری روایات کو نظرانداز کر کے قرآن کریم کی تفسیر وتشریح جو چاہے کرے تو قرآن بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔

لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم زیر بحث مسئلہ میں کوئی قطعی فیصلہ دینے سے پہلے احادیث وآثار' فقہاء' مجتہدین کے اجتہادات پر ایک نظر ڈال لیں۔ اس سلسلے میں وہ بنیادی حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ جس کی نشاندہی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے کی کہ:

"وفی الجملة من عدل عن مذاهب الصحابة والتابعين وتفسيرهم الى ما يخالف ذلك كان مخطئاً فی ذلك بل مبتدعاً ..... ونحن نعلم ان القرآن قرأه الصحابة والتابعون وتابعوهم وانهم كانوا اعلم بتفسيره ومعانيه كما انهم اعلم بالحق الذی بعث الله به رسوله فمن خالف قولهم وفسر القرآن بخلاف تفسيرهم فقد اخطأ فی الدليل والمدلول جميعا" (مقدمه فی اصول التفسير' ص ٣٦١)

''حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہؓ تابعین کے مذاہب اور ان کی تفسیر کو ترک کر کے مخالف مذہب اور تفسیر اختیار کرنے والا خطاکار بلکہ بدعت کا ارتکاب کرنے والا ہے .....

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین نے قرآن پڑھا اور یہ لوگ قرآن کی تفسیر اور معانی سے سب سے زیادہ واقف ہیں' جس طرح یہ لوگ اس سچائی سے سب سے زیادہ واقف تھے جس کو لے کر نبی اکرم ﷺ بھیجے گئے تھے۔ لہٰذا جس شخص نے ان کے قول کی مخالفت کی اور ان کی تفسیر کے خلاف قرآن کی تفسیر کی اس نے دلیل اور مدلول دونوں میں غلطی کی''۔

سبیل اللہ کا لغوی معنی کیا ہے؟

علامہ ابن الاثیرؒ اپنی کتاب النہایۃ فی غریب الحدیث میں لکھتے ہیں:

''السبیل فی الاصل :الطریق وسبیل اللّٰہ عام یقع علی کل عمل خالص سلك به طریق التقریب الی اللّٰہ عزوجل باداء الفرائض والنوافل وانواع التطوعات واذا اطلق فهو فی الغالب یقع علی الجهاد حتی صار لکثرة الاستعمال کانه مقصور علیه''

(النهایة فی غریب الحدیث' ج ۲' ص ۳۳۸)

لسان العرب میں ہے:

''وکل ما امر اللّٰہ به من الخیر فهو من سبیل اللّٰہ واستعمل السبیل فی الجهاد اکثر لانه السبیل الذی یقاتل فیه علی عقد الدین وقوله فی سبیل اللّٰہ ارید به الذی یرید الغزو ولا یجد ما یبلغه بمغزاة فیعطی من سهمه'' (لسان العرب' ج ٤' ص ۲۱۰)

مذکورہ بالا عبارات سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

ایک تو یہ کہ لغت کے اعتبار سے سبیل اللہ کا اصل معنی ہر اس عمل خالص کو شامل ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہو۔ لہٰذا اس میں تمام نیک کام شامل ہو گئے خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔

دوسری یہ کہ سبیل اللہ جب مطلق بولا جاتا ہے قرائن کے بغیر تو اس سے عموماً جہاد مراد ہوتا ہے' جہاد کے مفہوم میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے۔

تمام فقہی مسالک کے اصحاب علم و تحقیق فقہاء کا مطالعہ یہ ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' شریعت کی اصطلاح ہے۔

سبیل اللہ لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ عام ہے' ہر کارِ خیر اس میں داخل ہے' کتاب اللہ و سنت میں بھی کہیں کہیں اسی عام لغوی معنی میں سبیل اللہ کا استعمال ہوا ہے' لیکن کتاب و سنّت اور صحابہ کرامؓ کی زبانوں پر سبیل اللہ کا استعمال جب قرائن کے بغیر مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد ہی مراد ہوتا ہے۔

قدیم مفسرین وفقہاء کے علاوہ دورِ جدید کے بعض علماء نے بھی کتاب و سنت میں ''فی سبیل اللہ'' کے استعمالات کا تتبع کر کے ''فی سبیل اللہ'' کے اسی مخصوص معنی کو ثابت کیا ہے۔ کتب حدیث میں ابواب الجہاد کی احادیث کا مطالعہ بھی اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

''واما قوله فی سبیل اللّٰه فانه یعنی وفی النفقة فی نصرة دین اللّٰه وطریقه وشریعته التی شرعها لعباده بقتال اعدائه وذلك هو غزو الکفار'' (جامع البیان' ج۱۰' ص ۱۱۴)

ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''سبیل الله عند الاطلاق هو الغزو''
(المغنی والشرح الکبیر' ج۲' ص ۶۹۷)

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ان المتبادر عند اطلاق لفظ من سبیل الله الجهاد''
(فتح الباری' ج۶' ص ۳۶)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''المتبادر الی الافهام ان سبیل الله تعالی هو الغزو واکثر ما جاء فی القرآن العزیز کذلك'' (المجموع شرح المهذب' ج۶' ص ۲۱۲)

المغنی میں ہے:

''کل ما فی القرآن من ذکر سبیل اللّٰه انما ارید به الجهاد الا الیسیر''
(ج۲' ص ۶۹۸)

جہاں تک سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت مصارف کا تعلق ہے کہ یہاں سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟ تو سلفاً خلفاً صحابہ و تابعین' ائمہ مجتہدین' قدیم زمانہ سے اب تک فقہاء و مفسرین کا یہی مسلک رہا ہے کہ آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد غزوہ و جہاد ہے۔ احادیث صحیحہ' آثار صحابہ و تابعین سے بھی اسی مفہوم کی تائید و تعیین ہوتی ہے۔ جبکہ بعض صحابہ اور بعض فقہاء سے یہ

منقول ہے کہ حجاج بیت اللہ بھی فی سبیل اللہ کے دائرہ میں شامل ہیں۔

غرض صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کو براہِ راست حضور اقدس ﷺ سے پڑھا اور سمجھا' ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ سے متعلق منقول ہیں' اُن میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ یہی دو تفسیریں صحابہ' تابعین و مفسرین و مجتہدین سے منقول ہیں۔ غزوہ و حج کے علاوہ دوسرے نیک کاموں کا ''فی سبیل اللہ'' میں شامل نہ ہونا قرونِ اولیٰ میں اجماعی رہا ہے۔ (جیسا کہ آگے حوالہ جات سے واضح ہوگا)

ابن العربی نے احکام القرآن میں یہاں تک نقل فرمایا ہے کہ سبیل اللہ کا مصداق اگرچہ بہت کچھ ہوسکتا ہے لیکن میرے علم میں اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آیت میں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد صرف غزوہ و جہاد ہے۔ (احکام القرآن' ج ۲' ص ۹۵۷)

اگر دیکھا جائے تو فی سبیل اللہ کا مصداق متعین کرنے کے سلسلے میں ہمیں ایک حدیث نبویؐ سے پوری رہنمائی ملتی ہے جو کہ زکوٰۃ ہی کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ کتب حدیث میں موجود ہے اور ناقدین حدیث نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حدیث مبارکہ یہ ہے:

عن عطاء بن یسار ان رسول اللّٰہ ﷺ قال :((لا تحل الصدقة لغنی الا لخمسة لغاز فی سبیل اللّٰہ او لعامل علیها او لغارم او لرجل اشتراها بماله او لرجل کان له جار مسکین فتصدق علی المکسین فاهداها المسکین للغنی)) (ابوداود' ج ۱' ص ۲۳۱)

اس حدیث میں ''فی سبیل اللہ'' کے ساتھ غازی کی قید لگا کر زبانِ نبوتؐ نے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کی مراد واضح کر دی۔

فی سبیل اللہ اور مفسرین اسلام

قرآن کریم کی کوئی بھی مستند تفسیر اٹھا کر دیکھ لی جائے تو ہر ایک میں یہی ملے گا کہ جمہور مفسرین و مجتہدین کے نزدیک فی سبیل اللہ کا مصداق راہ خدا میں غزوہ و قتال کرنے والے مجاہدین ہیں۔ ہاں صحابہ کرام میں حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول تفسیر و فقہ میں ملتا ہے کہ حج کرنے والے افراد بھی ''فی سبیل اللہ'' کے دائرے میں آتے ہیں۔ ابن جریر کی تفسیر درج ذیل ہے:

''اما قوله وفی سبیل اللّٰہ فانه یعنی وفی النفقة فی نصرة دین اللّٰہ

وطریقه وشریعته التی شرعها لعباده بقتال اعداء ه وذلك هو غزو الكفار وبالذی قلنا فی ذلك قال اهل التاویل ... حدثنی یونس قال اخبرنا وهب قال قال ابن زید فی قوله وفی سبیل اللّٰه قال الغازی فی سبیل اللّٰه" (جامع البیان' ج ۱۰' ص ۱۱٤)

اس کے بعد ابن جریرؒ نے دو احادیث نقل فرمائی ہیں جن سے اسی تفسیر کی تائید وتعیین ہوتی ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ الدر المنثور میں لکھتے ہیں:

"وفی سبیل اللّٰه اخرج ابن ابی حاتم عن مقاتل فی قوله (وفی سبیل اللّٰه) قال هم المجاهدون واخرج ابن ابی حاتم وابو الشیخ عن ابن زید فی قوله وفی سبیل اللّٰه قال الغازی فی سبیل اللّٰه"

(الدر المنثور' ج ٤' ص ۲۲۵)

ابن العربی اپنی مایۂ ناز کتاب احکام القرآن میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال مالك سبل اللّٰه كثیرة ولكنی لا اعلم خلافاً فی ان المراد بسبیل اللّٰه ههنا هو الغزو ومن جملة سبیل اللّٰه الا ما یؤثر عن احمد واسحاق فانهما قالا انه الحج والذی یصح عندی من قولهما ان الحج من جملة السبل مع الغزو لانه طریق بر ..... وهذا یحل عقد الباب ویخرم قانون الشریعة ونیثر سلك النظر وما جاء قط باعطاء الزكوة فی الحج اثر" (احکام القرآن' ج ۲' ص ۹۵۷)

یہ اقتباس ان لوگوں کے لیے بڑا فکر انگیز ہے جو فی سبیل اللہ کا لفظی عموم دیکھ کر سلف کے اجماع سے آنکھیں بند کر کے ہر کارِ خیر کو فی سبیل اللہ کے دائرہ میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح تفسیر قرطبی میں ہے:

"قوله تعالی وفی سبیل اللّٰه وهم الغزاة ومواضع الرباط یعطون ما ینفقون فی غزوهم كانوا اغنیاء او فقراء وهذا قول اكثر العلماء وهو

تحصیل مذهب مالك وقال ابن عمر الحجاج والعمار ويؤثر عن احمد واسحاق رحمهما الله انهما قالا سبيل الله الحج"

(الجامع لاحكام القرآن' ج٤' ص ١١٧)

امام جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وفی سبيل الله روى ابن ابى ليلى عن عطيه العوفى عن ابى سعيد الخدرى عن النبى ﷺ قال :((لا تحل الصدقة لغنى الا فى سبيل الله او ابن السبيل او رجل له جار مسكين تصدق عليه فاهدى له)) واختلف الفقهاء فى ذلك فقال قائلون للمجاهدين الاغنياء منهم والفقراء وهو قول الشافعى ' وقال الشافعى لا يعطى منها الا الفقراء منهم ولا يعطى الاغنياء من المجاهدين فان اعطوا ملكوها وأجزأ المعطى وان لم يصرفه فى سبيل الله لان شرطها تمليكه وقد حصل لمن هذه صفته فاجزأ۔ وقد روى ..... وان اعطى حاجّا منقطعاً به اجزى ايضاً وقد روى عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان رجلاً اوصى بماله فى سبيل الله فقال ابن عمر رضی اللہ عنہ ان الحج فى سبيل الله فاجعله فيه وقال محمد ابن الحسن فى السير الكبير فى رجل اوصى بثلث ماله فى سبيل الله انه يجوز ان يجعل فى الحاج المنقطع به وهذا يدل على ان قوله تعالى وفى سبيل الله قد اريد به عند محمد الحاج المنقطع به ..... روى عن ابى يوسف فى من اوصى بثلث ماله فى سبيل الله انه الفقراء الغزاة"(احكام القرآن' ج٣' ص ١٨٦)

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر' ج ٢' ص ٣٧٣' تفسیر کبیر' ج ١٦' ص ١١٣' تفسیر خازن' ج ٢' ص ٩٢' روح المعانی' ج ٤' ص ١٢٣)

خلاصہ یہ ہے کہ مفسرین نے عموماً فی سبیل اللہ کی تفسیر میں دو قول ہی نقل کیے ہیں۔ پہلا قول جمہور فقہاء و مفسرین کا جس کے مطابق فی سبیل اللہ کا مصداق صرف مجاہدین ہیں اور دوسرا قول یہ کہ حاجی بھی فی سبیل اللہ کے مصداق میں شامل ہے۔

تو جب آیاتِ احکام میں سے کسی آیت کی تفسیر کے متعلق اگر عہد صحابہؓ سے لے کر صدیوں تک دو ہی قول رہے ہیں تو ان دونوں اقوال سے ہٹ کر کوئی تیسرا قول اختیار کرنا

ہرگز درست نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی تیسرا قول اختیار کرنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ صدیوں تک اس آیت کا صحیح مفہوم ومصداق اُمت سے مخفی رہا۔ خصوصاً ایسی آیت جو کثیر الوقوع عملی مسائل سے تعلق رکھتی ہو اور اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن کی ادائیگی اس سے متعلق ہو۔ اگر اس کی اجازت دی گئی تو معانیٔ قرآن میں تحریف کا بہت بڑا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ بات بالکل نہیں بھولنی چاہئے کہ قرآن کی تفسیر میں جو مقام صحابہ وتابعین کا ہے وہ بعد کے لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ صاحبِ وحی سے کتاب اللہ کو بلاواسطہ پڑھا اور سمجھا۔ اور جو کچھ بیان کیا وہ وہی بیان کیا جو حضور ﷺ سے سنا اور سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابی کی تفسیر کو حدیث مرفوع کے درجہ میں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ امام حاکم مستدرک اور علوم الحدیث میں فرماتے ہیں:

"ان تفسير الصحابى الذى شهد الوحى له حكم المرفوع فكانه رواه النبى ﷺ" (تدريب الراوى' ص ٢٩)

ابن قیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"لا ريب ان اقوالهم فى التفسير اصوب من اقوال من بعدهم وقد ذهب بعض اهل العلم الى ان تفسيرهم فى حكم المرفوع قال ابوعبد الله الحاكم فى مستدركه وتفسير الصحابى عندنا فى حكم المرفوع" (اعلام الموقعين ج ٤' ص ١٥٤)

اسی وجہ سے محققین کی بڑی جماعت نے فرمایا کہ صحابہؓ اپنی رائے سے بھی اگر تفسیر کریں تو ان کی رائے زیادہ درست ہوگی' کیونکہ وہ کتاب اللہ کو زیادہ سمجھنے والے اور اہل لسان تھے۔

اصولیین نے تصریح فرمادی ہے کہ عہد صحابہ وتابعین میں اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے اور وہ اختلاف دو قولوں پر منحصر ہو تو بعد والوں کے لیے ان دو قولوں کے علاوہ کسی تیسرے قول کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ مسلّم الثبوت میں ہے:

مسئلة :ولم يتجاوز اهل العصر عن قولين فى مسئلة لم يجز احداث قول ثالث عند الاكثر وخصّه بعض الحنفية بالصّحابة وقالوا اذا اختلف الصحابة على قولين لم يجز احداث ثالث ..... الخ

(مسلم الثبوت' ص ٢١١)

علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ان احکام الشرع هی ما فهمه الصحابة والتابعون وتابعوهم ورحمه الله من الكتاب والسنة بموجب اللسان العربی المبين ..... واما المتاخرون من الفقهاء فليس لهم الا ان يتكلموا فی نوازل جديده لا ان يبدوا آراء فی الشرع علی خلاف ما فهمه من النصوص رجال الصدر الاول الذين هم اللسان المطلعون علی لغة التخاطب بين الصحابة قبل ان يعتورها تغيير وتحوير والمتلقون للعلم من الذين شهدوا الوحی مما فهموه من الشرع فهو المفهوم وما ابعدوه ان يكون دليلاً بعيد ان يتمسك به ..... الخ"

(مقالات الکوثری، ص ۲۵۸)

اور یہ امر متعین ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں "فی سبیل اللہ" کی تفسیر میں صرف دو ہی قول ملتے ہیں (جو ذکر ہوئے)۔ اب بعد میں کسی "اجتہاد جدید" یا قیاس کے ذریعہ تیسرے قول کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ان دو قولوں پر سلف کا اجماع ہو گیا ہے۔ اب کوئی اجتہاد اس اجماع کے خلاف ہوگا تو وہ واجب الرد ہوگا۔ نور الانوار میں ہے:

"والامة اذا اختلفوا فی مسئلة فی ایّ عصر كان علی اقوال كان اجماعاً منهم علی ان ما عداها باطل ولا يجوز لمن بعدهم احداث قول آخر ..... وقيل هذا فی الصحابة خاصة ای بطلان القول الثالث فی الصحابة فقط فانهم ان اختلفوا علی قولين كان اجماعاً علی بطلان القول الثالث دون سائر الامة ولكن الحق ان بطلان القول الثالث مطلق يجری فی اختلاف كل عصر وهذا يسمی اجماعاً مركبا" (نور الانوار، ص ۲۲۳)

دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ خاص طور سے فی سبیل اللہ کے مصرف کے تحت ایک صدی سے جو زور لگ رہا ہے اور جو امور اس کے مصداق میں ذکر کیے جا رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر عہد نبویؐ اور عہد صحابہ میں موجود تھے یا اور آگے بڑھ کر متقدمین کے عہد میں بھی موجود تھے لیکن کوئی معتمد نقل صحابہ یا ائمہ سے ایسی نہیں ملتی کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ان حضرات

نے اس قسم کے امور میں ''فی سبیل اللہ'' کی بنیاد پر زکوٰۃ کا مال لگایا یا صرف کیا ہو یا اس کی اجازت دی ہو۔

مانا کہ موجودہ عہد میں جہاد کی بہت سی اقسام ہیں (لسانی' فکری' قلمی' سیاسی جہاد وغیرہ) جنہیں بڑے زور وشور سے کیا جارہا ہے تو یہ دور حاضر کی پیداوار نہیں ہے۔ سب نہ سہی ان میں بہت سی اقسام ہر عہد میں تھیں۔ تاریخ کے ہر دور میں لسانی' فکری اور قلمی جہاد کے مختلف محاذ کھلے ہوئے تھے۔ اسلاف ان محاذوں پر اپنی علمی وفکری توانائیاں صرف کررہے تھے۔ دین کی حفاظت' نشر واشاعت اور اس کی طرف سے دفاع کا کام زبان وقلم سے ہر عہد میں لوگوں نے کیا ہے۔ مصالح عامہ اور رفاہی کاموں کی بہتات ہر عہد میں رہی ہے اور ایسی بہت سی چیزیں شاید اس زمانہ میں زیادہ اہم رہی ہوں لیکن ان سب کو اس مصرف کے تحت کسی قابل ذکر امام ومجتہد نے شمار نہیں کیا ہے۔

فی سبیل اللہ ——— مجتہدین کی نظر میں

کتب تفاسیر کے مذکورہ بالا اقتباسات سے فقہاء ومحدثین کی ''فی سبیل اللہ'' کے بارے میں آراء اگرچہ واضح ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی کتب فقہ سے چند مزید اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں تاکہ فقہاء مجتہدین کے اقوال ودلائل زیادہ آئینہ ہو کر سامنے آجائیں۔

مشہور فقیہہ ابن رشد فی سبیل اللہ کے بارے میں مجتہدین کے مذاہب نقل کرتے ہیں:

"واما فی سبیل اللّٰہ فقال مالك سبیل اللّٰہ مواضع الجهاد والرباط وبه قال ابوحنیفة وقال غیره الحجاج والعمار وقال الشافعی هو الغازی جار الصدقة" (بدایة المجتهد' ج۳' ص ۱۲۸)

المجموع شرح المہذب میں ہے:

"ومذهبنا ان سهم سبیل الله المذکورة فی الآیة الکریمة یصرف الی الغزاة الذین لاحق لهم فی الدیوان بل یغزون متطوعین وبه قال ابوحنیفة ومالك رحمهما اللّٰہ وقال احمد رحمه اللّٰہ تعالٰی فی اصح الروایتین عنه یجوز صرفه الی مرید الحج وروی مثله عن ابن عمر رضی اللہ عنہ....." (ج٦' ص ۲۱۲)

المغنی میں ہے:

"اختلف الرواية عن احمد فی ذلك فروی عنه انه لا یصرف منها فی الحج وبه قال مالك وابوحنیفة والشافعی وهی اصح ..... وروی عنه ان الفقیر یعطی قدر ما یحج به الفرض او یستعین به فیه یروی اعطاء الزکوة فی الحج عن ابن عباس وعن ابن عمر الحج من سبیل الله"

(المغنی' ج۲' ص ۷۰۲)

جہاں تک فقہاء احناف کا تعلق ہے تو ان کی آراء کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ فقہائے احناف کے نزدیک عاملین زکوٰۃ کے علاوہ زکوٰۃ کے تمام مصارف میں استحقاق زکوٰۃ کے لیے فقر کی شرط ہے۔ یعنی فی سبیل اللہ کا مصداق جس طبقہ کو بھی قرار دیا جائے تو وہ فقیر اور حاجت مند ہونے ہی کی صورت میں زکوٰۃ کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا فی سبیل اللہ کے بارے میں فقہاء احناف کے درمیان جو بھی اختلاف ہو وہ زکوٰۃ کے تعلق سے لفظی اختلاف ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ البحر الرائق میں ہے:

"ولا یخفی ان قید الفقر لابد منه علی الوجوه کلها"

(البحر الرائق' ج۲' ص ۲۴۲)

فتح القدیر میں ہے:

"انما یعطی الاصناف کلهم سوی العامل بشرط الفقر"

(ج۲' ص ۲۶۹)

چنانچہ فی سبیل اللہ کے بارے میں فقہائے احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"(وفی سبیل الله) فهم فقراء الغزاة هكذا قال ابویوسف وقال محمد هم فقراء الحجاج المنقطع بهم" (مبسوط' ج۲' ص ۱۲)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ومنها فی سبیل الله وهم منقطع الغزاة الفقراء منهم عند ابی یوسف وعند محمد منقطع الحاج الفقراء منهم" (ج۱' ص ۱۸۸)

البحر الرائق میں ہے:

"(قوله منقطع الغزاة) هو المراد بقوله تعالیٰ وفی سبیل اللّٰه وهو اختیار منه لقول ابی یوسف وعند محمد منقطع الحاج" (ج۲' ص ۲۴۲)

عمدۃ القاری میں ہے:

"(قوله وفی سبیل الله) وهو منقطع الغزاة عند ابی یوسف ومنقطع الحاج عند محمد" (ج ٦' ص ٤٨٧)

حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

"وفی سبیل اللّٰه ای ولمن فی سبیل اللّٰه فان المصرف الشخصی وهو منقطع الغزاة ای الذین عجزوا عن اللحوق بجیش الاسلام بفقرهم بهلاك النفقة او الدابة او غیرهما فتحل لهم الصدقة"

(حاشیة الطحطاوی' ج ٢' ص ٣٩٧)

فقر کی شرط لگانے کے بعد شیخین اور امام محمد کا اختلاف زکوٰۃ کے بارے میں زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں رہ جاتا۔ لیکن پھر بھی فقہائے احناف نے عموماً شیخین کے قول کو صحیح اور مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"والصحیح قول ابی یوسف کذا فی المضمرات" (ج ١' ص ١٨٨)

علامہ طحطاوی لکھتے ہیں:

"قوله (وهو منقطع الغزاة) ..... وهذا التفسیر اختیار ابی یوسف قال فی غایة البیان وهو الاظهر وقال الاستیجابی انه الصحیح ..... وقد علمت ان المختار قول ابی یوسف "(ج ٢' ص ٣٩٨)

غرض یہ کہ فی سبیل اللہ کے بارے میں ائمہ مجتہدین کی آراء کا خلاصہ یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف نے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں صرف فقیر غازی کو داخل کیا ہے جبکہ امام مالک اور امام شافعی نے غازی فقیر کے ساتھ ساتھ غازی غنی دونوں کو داخل کیا ہے' جبکہ امام احمد اور امام محمد نے محتاج حاجی کو بھی داخل کیا ہے۔

اور جہاں جہاں عمومیت کی بات ہے تو وہاں فقر و احتیاج کی بھی قید ہے۔ لہٰذا اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم کو عام بھی کیا جائے تو فقر اور احتیاج کی قید کے ساتھ کیا جا سکتا ہے' اس کے بغیر عمومیت کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

تو صرف فی سبیل اللہ کے لفظی عموم کے پیش نظر غلط فہمی میں مبتلا ہونا اور آیت مصارف میں فی سبیل اللہ کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اس میں وہ تمام امور داخل ہیں جو کسی بھی حیثیت سے نیکی اور عبادات کے امور میں شامل ہیں' چاہے وہ کسی قسم کے رفاہی کام ہوں یا دین کی

نصرت و دفاع اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں کوئی کام ہو' یہ سراسر غلط اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے۔

کیونکہ اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں یہ بات متفق علیہ اور اجماعی رہی کہ مسجد کی تعمیر' رفاہی کاموں اور دیگر نیک کاموں میں زکوٰۃ کا صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر ہم فی سبیل اللہ کو عام کر کے تمام رفاہی کاموں اور نیک کاموں کو اس دائرے میں لے آئیں تو اس سے صدیوں تک برقرار اجماع کی مخالفت لازم آئے گی۔

ائمہ اربعہ' فقہائے ملت میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں' مساجد کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارفِ زکوٰۃ میں داخل ہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس کے خلاف تصریحات ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ مصالح مسلمین یا کسی اور کارِ خیر میں زکوٰۃ خرچ کرنے کو فقہائے اسلام نے متفقہ طور پر ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ زاہد الکوثریؒ "الافصاح عن معانی الصحاح" سے ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کرتے ہیں:

"واتفقوا على انه لا يجوز ان تخرج الزكوٰة الى بناء مسجد ولا تكفين ميت وان كان من القرب لتعين الزكوة لما عنيت له"

اس کے بعد علامہ کوثریؒ لکھتے ہیں:

"يريد اتفاق ابى حنيفة ومالك والشافعي واحمد واصحابهم على عدم تجويز ذلك وهذا نتيجة اتفاق من قبلهم من فقهاء الصحابة والتابعين" (مقالات الکوثری' ص ۱۸۹)

کتاب الاموال میں ہے:

"فاما قضاء الدين عن الميت والعطية فى كفنه وبنيان المساجد ..... وما اشبه من انواع البر ..... يجمعون على ان ذلك لا يجزى من الزكوٰة لانه ليس من الاصناف الثمانية ..... الخ"

(کتاب الاموال' ص ۱۰٤)

شرح الصغیر میں ہے:

"فهذه الاصناف الثمانية ..... فلا نجزئ لغيرهم ..... الخ"

(شرح الصغیر' ج۲' ص ۱۲۲)

المغنی میں ہے:

"ولا یجوز صرف الزکوۃ الی غیر من ذکر اللّٰہ تعالٰی من بناء المساجد والقناطر والسقایات واصلاح الطرقات ... واشباہ ذلك من القرب التی لم یذکرھا اللہ تعالٰی (المغنی ج۲' ص ۵۲۷)

بدائع الصنائع میں ہے:

"وعلٰی ھذا یخرج صرف الزکوۃ الی وجوہ البر من بناء المساجد والرباطات والسقایات واصلاح القناطر وتکفین الموتی ودفنھم انہ لا یجوز لانما لم یوجد التملیك اصلاً" (بدائع الصنائع' ج۲' ص ۳۹)

نیز اِن تصریحات سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے معیّنہ آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تمام فقہاء کرام کے ہاں تملیک شرط ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ تملیک کا مسئلہ صد فیصد متفق علیہ نہیں ہے' دین وشریعت کے بارے میں عدم واقفیت کی دلیل ہے۔

فقہاء کرام نے تملیک کی شرط جن نکات کی وجہ سے لگائی ہے اس سلسلے میں یہ نکات قابل ذکر ہیں:

(۱) قرآن مجید نے مصارفِ زکوٰۃ کا آغاز ''لام'' سے کیا ہے جو کہ تملیک کے لیے ہے۔ (ملاحظہ ہو روح البیان' ج۳' ص ۴۵۳۔ تفسیر خازن ج۲' ص ۹۲' تفسیر قرطبی' ج۴' ۱۰۷)

(۲) قرآن کریم نے متعدد مواقع پر وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فرمایا اور یہ ایتاء اعطاء کے معنی میں ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے۔ جیسے مہر سے متعلق ارشاد ہوا کہ ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ یہاں بھی ایتاء تملیک کے معنی میں ہے۔ شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"والاصل فیہ ان الواجب فیہ فعل الایتاء فی جزء من المال ولا یحصل الایتاء الا بالتملیك فکل قربة خلت عن التملیك لا تجزئ عن الزکوۃ" (مبسوط' ج' ص ۲۶۹)

رہ گئی یہ بات کہ اس مدّ خاص میں ''لام'' کے بجائے ''فی'' کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ تو علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ ''فی'' عربی زبان میں ظرف پر داخل ہوتا ہے اور ظرف مظروف کا احاطہ واستیعاب کر لیتا ہے۔ اس طرح ظرف کے ساتھ تعبیر تاکید بلیغ اور اہتمام خاص کو بتاتی ہے۔ چونکہ پہلے چاروں مدّات کے مقابلے میں بعد کے چاروں مدات کی

وعیت زیادہ اہم تھی اس لیے ان پر ''فی'' داخل کیا گیا۔ خصوصیت سے سبیل اللہ میں تو محض عطف پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ''رقاب'' اور ''غارمین'' کے ذکر کے بعد مستقل طور پر ''فی سبیل اللہ'' فرمایا گیا۔

''فان قلت لم عدل اللام الی فی فی الاربعة الا خیرة قلت للایذان بانهم ارسخ فی استحقاق التصدق علیهم مما سبق ذکره لان فی للوعاء فنبه علی انهم أحقاء بان توضع فیهم الصدقات ویجعلوا مظنه لها ومصبا ..... وتکریر ''فی'' فی قوله فی سبیل الله وابن السبیل فیه فضل ترجیح لهذین علی الرقاب والغارمین'' (الکشاف' ج ۲' ص ۲۸۳)

بہرحال اوپر ذکر کیے گئے تمام حوالہ جات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ فی سبیل اللہ کے بارے میں ابتداء اسلام سے دو ہی مسلک معروف رہے۔ صحابہ کرام' تابعین' ائمہ متبوعین' ائمہ تفسیر وفقہاء کرام نے فی سبیل اللہ کے لفظ کو مجاہدین اور حجاج کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے۔ اور جن فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ فقیر وحاجت مند ہوں۔ ان کا استحقاقِ زکوٰۃ ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل کیے جانے پر موقوف نہیں ہے۔

ان تصریحات اور حوالہ جات کی ضرورت اس لیے پڑی کہ دور حاضر میں بعض مصنفین اپنے مضامین میں اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ''فی سبیل اللہ'' کے اندر تعمیم کرتے ہوئے ہر دینی' رفاہی کام کرنے والی انجمنوں' اکیڈمیوں کو ''فی سبیل اللہ'' میں داخل کیا جائے اور زکوٰۃ کی رقم سے ان علمی اور اشاعتی اداروں کے بازو مضبوط کیے جائیں جو الحاد ولادینیت کے خلاف صف آراء ہیں (اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر کوئی اپنے اشاعتی ادارے کے لیے فکرمند ہے)

اور مزید یہ کہ علماء کرام اور مفتیانِ عظام کو اس بات کی دعوت دی جارہی ہے کہ وہ اس معاملے کے اندر ''حکمت'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمہور صحابہ' جمہور ائمہ وفقہاء کے متفقہ مسئلہ کی خلاف ورزی کریں کہ جمہور فقہاء کے مفتیٰ بہ اقوال کی آج کے زمانے میں ضرورت نہیں ہے' اور موجودہ زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے ''فی سبیل اللہ'' کے اندر تعمیم کا مظاہرہ کر کے ان کی اکیڈمیز' اور انجمنز کو اس کے اندر داخل کریں۔

اسی نظریہ کی حمایت میں ایک مضمون جو کہ سوال کے ساتھ بھی منسلک ہے جس میں اپنی

ضروریات کے رونے کے' اصحاب مدارس پر غیظ وغضب کے' اور جذباتیت کے سوا دلائل نام کی کوئی ایسی علمی یا قابل توجہ بات نہیں ہے جس کے متعلق کچھ کہا جائے (ماسوائے اجتہاد کے کہ جس کے متعلق مضمون نگار کی غلط فہمی کو آگے دور کیا جائے گا)

لیکن چونکہ اس قسم کے جذباتیت سے بھرپور لفاظی سے مرقع ومزین (حقیقتاً بے دلیل) مضامین سے عوام کے شکوک وشبہات میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہے تو اسی وجہ سے ''فی سبیل اللہ'' کے بارے میں گزشتہ اوراق میں صحابہ' جمہور فقہاء کے اقوال کو تفصیلاً ذکر کیا تاکہ ہر عامی کو بھی پتہ چل جائے کہ ''فی سبیل اللہ'' کے بارے میں وہ معروف ومشہور مسلک کیا ہے کہ جس کو جمہور نے اختیار کیا اور جس پر جمہور کا اجماع ہو گیا۔

لہٰذا آج کے تمام ایسے باطل نظریات جو جمہور اُمت' ائمہ مجتہدین اور سلف کے اقوال کے خلاف اور اجماع کے خلاف ہوں وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں' نہ ہی ان میں قیاس اور جدید اجتہاد کی گنجائش ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں بھی گزرا کہ اُمت جب کسی مسئلہ میں کسی زمانہ میں چند اقوال پر اختلاف کرے تو اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور رائے رکھنا باطل ہے۔ (نورالانوار' ص ۲۲۳)

اگر اس طرح کے شاذ ونادر اور باطل نظریوں کو قابل اعتناء سمجھا گیا تو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح کے نظریات تو تلاش کرنے سے ہر مسئلہ میں مل جائیں گے۔

ائمہ تفسیر وفقہاء کی مذکورہ بالا تصریحات سے قطع نظر صرف ایک بات پر غور کر لینا ہی اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اگر مصرف زکوٰۃ میں اتنا عموم ہوتا کہ ہر کارِ خیر کو اس میں شامل کیا جاتا تو قرآن کریم میں ان آٹھ مصارف کا بیان (نعوذ باللہ) بالکل فضول اور لغو ہو جاتا۔ حالانکہ قرآن کریم میں حصر کے ساتھ زکوٰۃ صرف کرنے کی آٹھ مدیں متعین کی گئی ہیں۔ حصر کے ساتھ آٹھ مصارف متعین کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ شریعت زکوٰۃ صرف کرنے کی کچھ حدود متعین کرنا چاہتی ہے۔ اگر فی سبیل اللہ کو عموم پر محمول کرتے ہوئے ہر کارِ خیر' دینی' دعوتی' اشاعتی کام کو اس میں شامل کر لیا گیا تو حصر کے ساتھ آٹھ مصارف متعین کرنا بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کہ:

''تقسیم صدقات کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی وغیر نبی کے حوالے کرنے کو پسند نہیں فرمایا' بلکہ خود ہی آٹھ مصارف متعین فرما دیے''۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں ہر کارِ خیر داخل ہو کر مصرف زکوٰۃ ہو تو معاذ اللہ ارشاد نبویؐ

بالکل غلط قرار پاتا ہے۔

نیز زکوٰۃ کے سلسلے میں آیات و احادیث کا وسیع ذخیرہ مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ زکوٰۃ کا سب سے بنیادی مصرف فقراء و مساکین ہیں۔ اسلام میں زکوٰۃ کا نظام دراصل سماج کے اسی حاجت مند اور معاشی طور پر پس ماندہ طبقہ کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہی نافذ کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حدیث معاذ میں زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا:

((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ)) (مشکوٰۃ ص ۱۵۵)

حدیث کا یہ ٹکڑا شہرت و استفاضہ کی شان رکھتا ہے۔ یہ حدیث تقریباً احادیث کی تمام مستند کتابوں میں موجود ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں مالداروں کی آمدنی کا ایک حصہ فقراء و مساکین کی ملکیت قرار دیا تاکہ فقراء اس سے اپنی ضروریات پوری کریں۔ اسی وجہ سے تاریخ اسلام کے ہر دور میں زکوٰۃ کی رقم فقراء و مساکین کو ملتی رہی اور ان کے لیے زکوٰۃ بہت بڑا اقتصادی سہارا رہی۔ اسلامی حکومتوں میں رفاہ عامہ، اجتماعی فلاح و بہبود، نشر و اشاعت کے بڑے بڑے کام کیے گئے لیکن زکوٰۃ کی رقم کو ہاتھ نہیں لگایا گیا، زکوٰۃ برابر فقراء و مساکین میں تقسیم کی جاتی رہی۔

آج جو لوگ زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کر کے ہر کارِ خیر کو شامل کرنا چاہتے ہیں یا فی سبیل اللہ کے دامن کو وسیع کر کے دین و ملت سے تعلق رکھنے والے ہر اجتماعی کام کو اس میں سمیٹنا چاہتے ہیں یا دین کی نصرت و دفاع کے ہر عمل کو فی سبیل اللہ کا فرد تصور کرتے ہیں وہ لوگ دراصل شعوری یا غیر شعوری طور پر فقراء و مساکین کو زکوٰۃ سے محروم کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں، حالانکہ زکوٰۃ کا اہم ترین مصرف سماج کا وہی عنصر ہے جو ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم ہے، جسے ہم فقراء و مساکین کے نام سے جانتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس نظریہ تقسیم کی جو بنیادی مضرت ہے وہ یہ کہ اگر بالفرض ہم نے جمہور امت کی اس متفقہ اور اجماعی کاوش کی خلاف ورزی اور عدول کر کے جدید اجتہاد کے تحت فی سبیل اللہ کا دائرہ کار وسیع کر دیا تو مساجد، مسافر خانوں اور دیگر رفاہی اداروں کی تعمیر و انتظام کرنے والے، دینی تحقیقاتی مراکز، اکیڈمیاں، انجمنیں، تصنیفی ادارے قائم کرنے والے اور دوسرے سینکڑوں قسم کے دینی اور عملی خدمت گزار زکوٰۃ کی رقم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ خدامِ دین کے نام پر اُمت کا ایسا طبقہ زکوٰۃ پر قابض ہو جائے گا کہ اصل مصرف والے ہاتھ

ملتے رہ جائیں گے۔

کالج اور یونیورسٹیاں چلانے والے خود کو خدام دین و مسلمین سے کیوں جدا سمجھیں گے؟ کہیں گے کہ ہم سے زیادہ دین و ملت کی خدمت کرنے والا کون ہے! ہم لوگ تو مسلمانوں کی نئی نسل کو لادینی کالجوں کے ایمان سوز ماحول سے بچا رہے ہیں۔

مسلم گرلز کالج قائم کرنے والے کہیں گے زکوٰۃ پر سب سے زیادہ حق ہمارا ہے' کیونکہ اگر ہماری لڑکیاں ان اسکول اور کالجوں میں تعلیم حاصل کریں گی جو غیر مسلموں کے زیر انتظام ہیں تو دین و ایمان کے ساتھ ان کی عزت و آبرو بھی خطرے میں پڑ جائے گی' لہٰذا ہم سب سے زیادہ اہم دینی کام کر رہے ہیں۔ اسلامی ہسپتال اور شفاخانے قائم کرنے والے کہیں گے کہ غیر مسلموں کے ہسپتالوں میں ہماری خواتین علاج و معالجہ کے لیے داخل ہونے پر مجبور ہوتی ہیں' زچگی کے مراحل انہیں غیر مسلموں کی زیر نگرانی طے کرنے پڑتے ہیں جس سے ان کی بے حرمتی اور بے آبروئی ہوتی ہے' ان شفاخانوں میں اصول و آداب کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا' لہٰذا ہم لوگ اسلامی شفاخانے' نرسنگ ہوم قائم کر کے سب سے بڑا دینی اور ملی کام کر رہے ہیں تو ہم زکوٰۃ کے اوّلین مستحقین میں سے ہیں۔ ممبران پارلیمنٹ بھی اپنا بہتہ زکوٰۃ کی رقم سے وصول کرنے لگیں گے' کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلمانوں کا خادم سمجھتے ہیں۔ اصحاب عرس و مزار اور اصحاب نیاز کو تو عمدہ مصرف ہاتھ لگ جائے گا۔

غرض اس وقت ہزار چیخا جائے لیکن فی سبیل اللہ کی توسیع کے دائرہ میں ''خدام دین و ملت'' اور ''مجاہدین اسلام'' لاکھوں کی تعداد میں دلفریب عنوانوں کے ساتھ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ کیونکہ اپنے زعم کے مطابق ہر کوئی دینی و ملّی کام میں مصروف ہے۔ پھر بھلا کوئی ان غریبوں کا کہاں خیال کر پائے گا جن کے پاس دلفریب عنوان ہے نہ زور بیان ہے اور نہ ہی رعنائی قلم ہے۔

لہٰذا فی سبیل اللہ میں نظریۂ تعمیم مزاج شرع سے بالکل موافقت نہیں رکھتا۔ ایسی صورت میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ شریعت نے جن مصالح اور اغراض و مقاصد کے پیش نظر نظامِ زکوٰۃ قائم کیا ہے وہ کہیں درہم برہم نہ ہو جائے۔

باقی جہاں تک عہد حاضر میں حالات کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ سترہویں صدی کے صنعتی اور فکری انقلاب کے بعد مغرب بڑی قوت سے اسلام پر حملہ زن ہوا اور اس نے فکری اور نظری یلغار عالم اسلام پر اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ شروع کر دی' جبکہ دوسری طرف

اسلام کے خادمین اور اس کے فکری و عملی محافظین کا رشتہ حکومت و سلطنت سے کٹ کر رہ گیا۔ وسائل و ذرائع سے محرومی ان کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن گئی کہ ان حالات میں کہ باطل پورے مادی وسائل کے ساتھ علم و قلم کی شمشیر بے نیام لے کر بڑھ رہا ہے' اسلامی سلطنتیں جو کہ مغربی تہذیب کے سامنے سپر انداز ہو چکی ہیں' ان کے بیش قدر ذرائع میں ثقافت اور تہذیب کے نام پر بددینوں کے لیے تو وافر حصہ ہے لیکن حفاظت اسلام کے لیے نہ صرف کوئی حصہ نہیں بلکہ وہ ایک جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان حالات میں وہ اسلام کی فکری مورچہ بندی اور اہلِ باطن کی صف شکنی اور مدافعت کے لیے کہاں سے وسائل لائیں!

لیکن اس کا مطلب اب یہ بھی نہیں کہ اس صورتحال میں ہم فی سبیل اللہ کے بارے میں جمہور ائمہ وفقہاء کے اجماعی مفہوم کو نظر انداز کر کے کسی نئے اجتہاد کے ذریعہ فی سبیل اللہ کے لغوی معنی کو اختیار کرتے ہوئے زکوٰۃ ہی سے ان ضروریات کی تکمیل کریں۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ زکوٰۃ محض رفاہ عام کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک عبادت ہے' اس کی حدود حق تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔

مانا کہ دورِ حاضر میں مختلف دینی و دعوتی کام' دین کی نصرت و دفاع کے لیے تحریکوں اور نشر و اشاعت کی اہمیت اور اس کے لیے کافی سرمایہ درکار ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور دوسری طرف عام مسلمانوں خصوصاً امراء اور اہل ثروت میں دینی حمیت اور مسابقت الی الخیرات کے جذبے کی کمی کا شکوہ بھی بالکل غلط نہیں کہ ان میں صدقاتِ نافلہ اور غیر زکوٰۃ کی مدّوں سے کثرت سے نہ دینے کا اہتمام واضح ہے۔ مسلمان رؤساء سے جو سرمایہ حاصل ہوتا ہے اس کا اکثر حصہ زکوٰۃ ہی کا ہوتا ہے۔ دین سے بے رغبتی اور بے توجہی کی وجہ سے اس قسم کے کاموں کے لیے علیحدہ سے مستقل رقم ہونا دشوار ہے۔

مانا کہ یہ باتیں حقیقت ہیں لیکن ان کے باوجود اس بات کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ''اجتہاد جدید'' کے ذریعہ فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کر دیا جائے۔ ہر درد کا مداوا زکوٰۃ ہی میں تلاش کرنا غلط ہے۔ زکوٰۃ کا ایک خاص مقصد ہے ''تؤخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم'' جو بہر حال نظر انداز نہیں ہونا چاہئے۔ استحقاقِ زکوٰۃ کے لیے فقر اور اداءِ زکوٰۃ کے لیے تملیک مستحق بنیادی شرطیں ہیں۔ واضح نصوص کی بنا پر بعض خاص جزئیات میں اصولاً استثناء کی گنجائش ہو سکتی ہے' مگر فقر و تملیک کی بنیادی شرطوں کو یکسر نظر انداز کر کے تمام ملی' دینی' اصلاحی' دعوتی' اشاعتی کاموں کے لیے زکوٰۃ کی رقم صرف

کرنے کی وکالت کرنا اور ہر قسم کے دینی، خیراتی کاموں میں بلا قید زکوٰۃ کی رقم دیے جانے کی حمایت کرنا ایسی اباحیت پسندی ہوگی جس کی نظیر سابقہ ادوار میں ملنا مشکل ہے۔ اس کے نتیجے میں مصرف زکوٰۃ میں جو عموم پیدا ہوگا اس سے زکوٰۃ کے اصل و بنیادی مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ قرآن مجید میں بیانِ مصارف کا اہتمام، رسول اللہ ﷺ کا اس پر من وعن سختی سے عمل کرنے پر اصرار اور مصارفِ زکوٰۃ میں کسی قسم کی توسیع اور من مانی سے واضح اور غیر متزلزل انکار یہ سب چیزیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

نظریۂ تعمیم پر ابھارنے والی ان ضروریات کی تکمیل کے لیے اولاً تو اس بات کی کوشش کی جائے کہ مسلمانوں سے دین سے بے رغبتی اور دعوتی کاموں سے بے توجہی کی اس غفلت کو دور کیا جائے، اور کوشش کی جائے کہ مسلمان سرمایہ داران دینی و دعوتی کاموں میں دلچسپی لیں۔

اور اگر کوشش کے باوجود بھی دینی تحریکوں اور تنظیموں کے چلانے کی صورت نہیں پیدا ہوتی تو ہم اتنے ہی مکلّف ہیں جتنا ہمارے اختیار میں ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ)

کوشش کے بعد ناکامی کی صورت میں ہم سے خدا کے یہاں اس کی بازپرس نہ ہوگی کہ ہم نے ایسا کام کیوں نہیں کیا۔ رہا دین و مذہب کی ترقی اور صیانت و حمایت اور اشاعت کا مسئلہ تو اصلاً تو اللہ ہی اپنے دین کا محافظ اور نگہبان ہے۔ ہماری کوششیں محض وسائل و ذرائع ہیں اور کوشش کرنے میں ہم اسی حد تک مکلّف ہیں کہ جتنا ہمارے اختیار میں ہے۔ اس کی وجہ سے ہم دلائل کی قوت، مسئلہ پر ایک طرح سے اجماع اور ہر عہد میں ایسے امور کے درپیش ہونے کے باوجود سلف و خلف کی مخالفت کی جسارت کیسے کر لیں؟ مصارفِ زکوٰۃ کے حصر کے ساتھ جو تفصیل ربّ العالمین نے فرمائی، جس کو خود رسول الثقلین ﷺ نے نہیں توڑا، اس کو آج ہم توڑنے لگیں تو یہ ہماری ایسی زیادتی ہوگی جو قابل معافی نہ ہوگی۔

لہٰذا یہ ضرورتیں توسع کا باعث نہیں بن سکتیں۔ چند لوگوں کی آراء اور ضرورت کے دعویٰ پر کان نہیں دھرا جا سکتا۔ کیونکہ اس طرح ہر کسی کی ضرورتوں پر اٹھنے والے نظریہ پر اجتہاد کرنے بیٹھ گئے تو اس سے دین کا چہرہ مسخ ہو جائے گا، دین قیم میں ترمیم و تنسیخ کا دروازہ کھل جائے گا۔ ہر دوسرا شخص جس کے ہاتھ میں قلم آ گیا تو وہ اپنی ضرورتوں کے مصالح گنوا کر علماء کرام اور مفتیانِ عظام کو دعوت دے دے گا کہ وہ بیٹھیں اور اس معاملے میں ''اجتہادِ جدید'' کریں۔

ہر دوسرا شخص نصوصِ صریحہ سے ثابت شدہ جمہور فقہاء و ائمہ کے اتفاقی اور اجماعی مسائل میں حالات وظروف کے بدل جانے کو بنیاد بنا کر علماء کو اس مسئلہ میں غور کرنے اور نئے سرے سے اجتہاد کرنے کی دعوت دے گا۔

مثلاً ایک گروہ اٹھے اور کہنا شروع کر دے کہ پچھلے زمانے میں دین سے رغبت کا دَور تھا' ہر شخص میں مسابقت الی الخیر کا جذبہ تھا' فرائض وعبادات اعمال کا شوق تھا' قویٰ مضبوط اور ہمتیں بلند تھیں' لہٰذا بیس رکعات تراویح اس زمانے کے بالکل عین مطابق تھیں' لیکن اب حالات بدل چکے ہیں' دین سے دوری' بے رغبتی اور بے توجہی کا دور ہے' اعمال وعبادات کا شوق نہیں ہے' فرائض بھی بمشکل پورے ہوتے ہیں' ہمتیں کمزور ہیں' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ چونکہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے' علماء کرام اور فتویٰ دینے والے حضرات کو چاہئے کہ پچھلے زمانے کے ''مُلْکًا عَاضًا'' کے دَور کے مفتیٰ بہ اقوال اور فتویٰ کو آج کے یکسر مختلف زمانہ پر چسپاں نہ کریں' بلکہ ''حکمت'' سے کام لے کر اجتہاد جدید کریں۔

دوسرا گروہ اٹھے گا اور تین طلاق کے اجماعی اور اتفاقی مسئلہ میں آج کل کے علماء کو دعوتِ فکر دے دے گا کہ چونکہ ایمان سے دوری کا زمانہ ہے' معاشرتی نظام خراب ہے' لوگوں میں برداشت کی کمی ہے' لہٰذا اس میں بھی علماء کو چاہئے کہ سر جوڑیں اور اجتہاد جدید کے ذریعہ آسانی کا پہلو نکالیں۔

غرض یہ کہ ہر شخص یا گروہ کسی نہ کسی مسئلہ کو لے کر اٹھے گا اور علماء کرام کو دعوت فکر دینا شروع کر دے گا۔ کوئی بعید نہیں کہ کوئی شخص دن بھر کی پانچ نمازوں کو بوجھ سمجھ کر اس میں کمی کی' حج کی مشقتوں کو دیکھ کر اس میں ترمیم کی (علیٰ ھذا القیاس) اور دیگر عبادات یا اجماعی مسائل کے اندر حالات وظروف کو بنیاد بنا کر نئے سرے سے اجتہاد کرنے کی دعوت دے دے۔

اس طرح کے ہر نظریہ پر اگر کان دھرنا شروع کر دیے یا اس طرح کی ضرورتوں کو بنیاد بنا کر اجتہادات شروع کر دیے تو واقعی یہ دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔

لہٰذا فقر واحتیاج کی شرط کے بغیر فی سبیل اللہ میں کسی قسم کی توسیع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس قسم کی اکیڈمیز' انجمنیں' رفاہی ادارے' دین کی نصرت ودفاع کے اور نشر واشاعت کے شعبے جہاں تملیک کی شرط نہیں پائی جاتی' زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہے' اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

☆ باقی ان تمام گزارشات سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ ہم دورِ حاضر میں اجتہاد کا

دروازہ مطلقاً بند کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔

بلکہ اجتہاد کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ بے شک اسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا روئے زمین پر آخری دین اور قرآن خاتم المرسلین ﷺ پر نازل ہونے والی آخری کتاب ہے۔ یہ دین ایک ابدی اور سرمدی دین ہے جو قیامت تک پیش آنے والے مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے نظام میں ایسی لچک اور گنجائش رکھی گئی ہے کہ کسی دور میں یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ دین اسلام انسانیت کی رہبری نہیں کر سکتا۔ شریعتِ اسلامی میں ایک عنصر ایسا ہے جو ہر دَور میں اس شریعت کو متحرک رکھتا ہے' جمود پیدا نہیں ہونے دیتا' وہ ہے اجتہاد' جس کے لغوی معنی ہیں اپنی بہترین کوشش صرف کرنا۔ لیکن اصطلاح شریعت میں نصوص شرعیہ کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کا حل دریافت کرنے کو کہتے ہیں۔

"استفراغ الجهد فی ادراك الاحكام الشرعية الفرعية عن ادلتها التفصيلية الراجعة كلياتها فی اربعة اقسام الكتاب والسنة والاجماع والقياس" (عقد الجید' ص ۸۔ الموافقات' ج ۱' ص ۲۵)

اسی قوت نے شریعت اسلامیہ کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھا۔ اجتہاد کی حیثیت جسد شریعت میں تازہ خون کی سی ہے جو شریعت کو ہر دور میں قابل عمل رکھتا ہے۔ تاہم یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اجتہاد بچوں کا کھیل نہیں کہ ہر کوئی یہ منصب سنبھال لے۔ اس کی بہت سی شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر اجتہاد کرنے کی کوشش کرنا تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

کتاب وسنت کے تمام احکام ابدی اور دائمی ہیں۔ ان میں کسی ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں ترمیم یا اضافہ کر دیا جائے تو اسلامی دستور کے مکمل اور دائمی ہونے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اسلام میں اجتہاد کی اجازت صرف ان امور میں دی گئی ہے جن میں کتاب وسنت کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے۔ لیکن ان امور میں جن کا ذکر صراحتاً قرآن وحدیث میں موجود ہے' ان میں ایک شخص تو کیا پوری اُمت کو بھی تبدیلی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اجتہاد کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب وسنت کے اصولی احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے اور ان کے صریح احکام کے منشاء کے خلاف کوئی ترمیم یا اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ عقد الجید میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"وشرطه انه لا بد له ان يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالاحكام ومواقع الاجماع وشرائط القياس وكيفية النظر ..... قال البغوی

والمجتهد من جمع خمسة انواع من العلم علم كتاب الله عزوجل وعلم سنة رسول الله ﷺ وعلم اقاويل علماء السلف من اجماعهم واختلافهم وعلم اللغة وعلم القياس وهو طريق استنباط الحكم عن الكتاب والسنة اذا لم يجده صريحاً في نص كتاب او سنة او اجماع فيجب ان يعلم من علم الكتاب ..... الخ" (عقد الجید' ص ۱۱)

اس کے برخلاف آج جولوگ اجتہاد اجتہاد کا نعرہ لگاتے ہیں بقول ان کے اسلام نے عبادات' سیاست' معیشت' معاشرت میں جو حدیں مقرر کی ہیں ان کو حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت بدلا یا توڑا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات تمدنی ضروریات اور زمانہ کی مصلحتوں کو بھی آڑ بنا کر اسلامی احکام میں تبدیلی کا وعظ کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی کانٹ چھانٹ میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اجتہاد نام ہے اسلام کی خود ساختہ توجیہہ کا' اس سے بحث نہیں کہ دور اوّل میں اسلامی کردار کیا رہا؟ اسلامی تعلیمات کے اصل حاملین نے اس کی کیا توجیہہ کی ہے؟

لیکن ان کو معلوم نہیں کہ اسلام میں مصلحت اور ضرورت کا پورا لحاظ کیا گیا ہے' مگر اس کے بھی حدود مقرر ہیں۔ ہر کس و ناکس کی ضرورت اور تمدنی مصلحت کی بناء پر ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

امام شاطبیؒ نے ایسے ہی لوگوں کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ان الشريعة مبنية على اعتبار المصالح وان المصالح انما اعتبرت من حيث وضعها الشارع كذلك لا من حيث ادراك المكلف"

(الموافقات' ج۲' ص ۱۱۰)

"وان سميت كلفة فاحوال الانسان كلها كلفة في هذه المدار في اكله وشربه وسائر تصرفاته ولكن جعل له قدرة عليها بحيث تكون تلك التصرفات تحت قهرة لا ان يكون هو تحت قهر التصرفات"

(الموافقات' ج۲' ص ۱۱۸)

بہرحال آج بہت سے ایسے نئے پیدا ہونے والے مسائل ہیں جن کا صریح جواب علماء سلف کی کتابوں میں نہیں ملتا' تو اس صورت میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ متبحر علماء بیٹھ کر کتاب وسنت اور فقہ قدیم کی روشنی میں ان کا حل تلاش کریں اور اجتہاد کریں۔

اور ایسی صورت میں کوئی شخص ان کے کیے ہوئے اجتہاد کو ''متاخرین کا اجتہاد'' کہہ کر رد نہیں کرے گا۔ البتہ اگر متاخرین میں سے کوئی شخص نصوص کے ہوتے ہوئے' جمہور ائمہ و فقہاء تک کے متعین کردہ مفہوم کے خلاف اور ائمہ مجتہدین کے اجماعی مسئلہ کے خلاف اجتہاد کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے گا تو پھر یقیناً متاخرین کے متاخرین' جمہور ائمہ سلف کے مقابلے میں اس متاخرین کے اجتہاد کو ضرور رد کر دیں گے اور نا قابل التفات گردانیں گے' بلکہ ایسا کرنا ضروری بھی ہوگا۔

بہرحال ہمارے زمانے میں اجتہاد ائمہ اربعہ کی رائے کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اسلاف کی محنتوں سے فائدہ اٹھانا ہی برکات و آسانی کا موجب ہے' ماضی سے ربط و سبق حاصل کرنا' حال پر غور و فکر کرنا' مستقبل کے لیے راستے صاف کرنا ہی عقلمندی ہے۔ ائمہ اربعہ کے خلوص' تقویٰ اور ان کے علم کے سمندر ہونے کا کون انکار کر سکتا ہے!

خلاصہ

زکوٰۃ کے ساتویں مصرف ''فی سبیل اللہ'' کے بارے میں جمہور اُمت کا نقطۂ نظر واضح ہو چکا جس کو پڑھنے کے بعد ضرور اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ مالِ زکوٰۃ صرف کرنے کے بارے میں اس روش پر چلنا سلامتی کی بات ہے جس پر امت مسلمہ چودہ سو سال تک چلتی رہی۔ قرآن کریم میں مذکور آٹھ مصارف کے علاوہ دوسرے رفاہی اور فلاحی کاموں میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

سورۃ التوبۃ کی آیت ۶۰ میں حصر کے ساتھ بیان کیا کہ زکوٰۃ صرف انہی آٹھ مدّوں میں خرچ کی جائے' ان سے باہر نہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

یعنی یہ آٹھ مصارف اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہیں' اللہ تعالیٰ جاننے والا' حکمت والا ہے۔

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ کی صراحت کر کے اعلان کر دیا کہ قیامت تک کسی کو ان مصارف میں ترمیم و اضافہ کا اختیار نہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت علم و حکمت کا حوالہ بڑا حکیمانہ اور معنی خیز ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کی تحدید اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں علم و حکمت کی روشنی میں کر دی ہے۔ کسی انسان کو اس کے بارے میں چوں چرا کرنے کی گنجائش نہیں

ہے اور نہ ہی اجتہاد جدید کے ذریعہ نئے مصارف تلاش کرنے کا جواز ہے۔ بلاشبہ سلامتی کی راہ وہی ہے جس پر امت مسلمہ چودہ سو سال تک چلتی رہی۔ گرے پڑے شاذ اقوال و نظریات کی پیروی کرنا' شریعت کی شاہراہِ عام کو چھوڑ کر پیچیدہ نامعلوم راہ پر چلنا خطرات سے خالی نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح فکر اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

فقط

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ فیصل رشید

المتخصص فی الفقہ الاسلامی

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن' کراچی

۵ رشعبان المعظم ۱۴۲۵ھ / ۲۱ ستمبر ۲۰۰۴ء

الجواب صحیح

محمد عبدالمجید دین پوری' نائب رئیس دارالافتاء

جامعۃ العلوم الاسلامیہ' علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

اور پانچ مزید مفتی حضرات کے دستخط

دوسرا جواب:

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ زکوٰۃ دین اسلام کا انتہائی اہم فریضہ ہے۔ عصر حاضر میں جس طرح دیگر ارکین اسلام کی حیثیت کو پامال کرنے کی ناپاک کوششیں کی جارہی ہیں اسی طرح اس اہم فریضہ یا اس کے متعلقات کو بھی متنازعہ بنانے کی خاطر بعض اداروں یا تنظیموں کی طرف سے دُنیوی مفاد کے حصول کے لیے سرتوڑ کوششیں کی جارہی ہیں۔ لیکن علماء حق" نے بہت عرصہ قبل ہی اس فتنہ کے دروازے کو قرآن' حدیث اور اصولِ اسلامی کی مضبوط دلیلوں سے ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔

صورتِ مسئولہ میں جس انجمن کے افکار ونظریات کے حوالے سے جو چند صفحات منسلک کیے گئے ہیں ان صفحات کی رو سے اس انجمن کا نظریہ مصارفِ زکوٰۃ میں جمہور فقہاء و

مفسرین کے خلاف ہے۔ کیونکہ ''فی سبیل اللہ'' کا لفظ اگرچہ لفظی معنی کے اعتبار سے بہت عام ہے' یعنی جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر کیے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہیں۔ البتہ جو لوگ حضور اکرم ﷺ کی تفسیر و بیان اور ائمۂ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعے اپنی ناقص عقل سے قرآن عظیم سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو مغالطہ ہوا کہ لفظ ''فی سبیل اللہ'' دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں اُن تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی بھی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہیں۔ مساجد' مدارس' شفا خانے یا مسافر خانوں کی تعمیر' کنویں' پل یا سڑکیں بنانا' تمام رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات کو ''فی سبیل اللہ'' میں داخل کر کے زکوٰۃ کا مصرف قرار دیا ہے جو سراسر غلط اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنہوں نے قرآن حکیم کو براہِ راست رحمتِ عالم ﷺ سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمۂ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں سب نے اس لفظ سے ''حجاج اور مجاہدین'' مراد لیا ہے۔ اور انہی کے اقوال کی روشنی میں ائمۂ تفسیر نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے۔ مثال کے طور پر چند مستند مفسرین کی تفاسیر ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

صاحب کشاف علامہ محمود بن عمر الزمخشریؒ تحریر فرماتے ہیں:

(وفی سبیل اللہ) فقراء الغزاۃ والحجیج المنقطع بھم

(تفسیر کشاف' جلد۲' ص ۱۹۸)

علامہ ابن جریر طبری ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' میں رقم طراز ہیں:

واما قولہ وفی سبیل اللہ فانہ یعنی وفی النفقۃ فی نصرۃ دین اللہ وطریقۃ وشریعۃ التی شرعھا لعبادہ بقتال اعدائہ وذلک ھو غزو الکفار وبالذی قلنا فی ذلک (جامع البیان فی تفسیر القرآن' جلد٦' ص ١١٤)

علامہ محمد بن حبیب الماوردیؒ ''تفسیر الماوردی'' میں فرماتے ہیں:

(وفی سبیل اللہ) ھم الغزاۃ المجاھدون فی سبیل اللہ یعطون سھمھم من الزکاۃ مع الغنی والفقر (تفسیر الماوردی' جلد٤' ص ٣٧٦)

الدکتور وھبۃ الزحیلی ''تفسیر منیر'' میں فرماتے ہیں:

(وفی سبیل اللّٰہ) ای القائمین بالجھاد ولو اغنیاء او للصرف فی

مصالح الجهاد بالاتفاق على التطوعة وشراء السلاح
(تفسیر منیر' جلد۹' ص ۲٦۰)

علامہ فخر الدین رازیؒ ''تفسیر کبیر'' میں فرماتے ہیں:

(فی سبیل الله) قال المفسرون یعنی الغزاة
(تفسیر کبیر' جلد۱۵' ص ۱۱۳)

علامہ شہاب الدین سید محمود آلوسیؒ ''روح المعانی'' میں فرماتے ہیں:

(فی سبیل الله) ارید بذلك عند ابی یوسف منقطعوا الغزاة وعند محمد منقطعوا الحجیج (روح المعانی' جلد٤' ص ۱۲۳)

ان مفسرین کے علاوہ بھی دیگر بے شمار مفسرین کرام نے اپنی اپنی تفاسیر میں ''فی سبیل اللہ'' کی تفسیر ایسے مجاہدین اور حجاج سے کی ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو۔ باقی جن حضرات نے دینی طلباء یا دیگر نیک کام کرنے والوں کو جو اِس میں شامل کیا ہے تو وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ فقیر اور حاجت مند ہوں' حالانکہ فقیر و حاجت مند زکوٰۃ کے مصارف میں سے سب سے پہلے مصرف میں داخل ہیں۔ فقہاءِ اُمت میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ رفاہِ عام کے ادارے' مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارفِ زکوٰۃ میں داخل ہیں' بلکہ اس کے خلاف ان کی واضح تصریحات موجود ہیں کہ مالِ زکوٰۃ کو اِن چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

فقہاءِ احناف میں سے شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

(وفی سبیل الله) فهم فقراء الغزاة هكذا قال ابویوسف وقال محمد هم فقراء الحجاج المنقطع بهم لما روی ان رجلاً جعل بعیراً له فی سبیل الله فامر رسول الله ﷺ ان یحمل علیه الحاج وابویوسف یقول الطاعات كلها فی سبیل الله ولكن عند اطلاق هذا اللفظ المقصود بهم الغزاة عند الناس (مبسوط ' جلد۳' ص ۱۲)

شافعی مسلک کی مستند ترین کتاب ''کتاب الام'' میں ہے:

ویعطی من سهم سبیل الله جل وعز من غزا من جیران الصدقة فقیراً كان او غنیا ولا یعطی منه غیرهم الا ان یحتاج ای الدفع عنهم فیعطاه من دفع عنهم المشركین (كتاب الام' جلد۲' ص ٦۲)

حنبلی مسلک کے امام موفق الدین اور امام شمس الدین رحمہما اللہ ''المغنی'' میں رقم طراز ہیں:

ولا یجوز صرف الزکوٰۃ الی غیر من ذکر اللہ تعالی من بناء المسجد والقناطیر والسقایات واصلاح الطرقات وسد البثوق وتکفین الموتی والتوسعۃ علی الاضیاف واشباہ ذلك من القرب التی لم یذکرھا اللہ تعالی (المغنی' جلد ۲' ص ۵۲۷)

مالکی مسلک کی اہم کتاب ''المدونۃ الکبریٰ'' میں ہے:

وقال مالك یعطی من الزکاۃ ابن سبیل وان کان غنیاً فی بلدہ اذا احتاج وانما مثل ذلك مثل الغازی فی سبیل اللہ یعطی منھا وان کان غنیاً ..... وقال مالك بن انس لا یجزئہ ان یعطی من زکاتہ فی کفن میت لان الصدقۃ انما ھی الفقراء والمساکین ومن سمی اللہ ولیس للاموات ولا لبنیان المساجد شیء (المدونۃ الکبریٰ' جلد ۱'ص ۲۹۹)

تو ائمۂ اربعہ کی تصریحات کی رو سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ زکوٰۃ کا مصرف ہر کارِ خیر نہیں ہے۔ نیز اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات وعبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا عام طور پر اس میں داخل ہوتا تو پھر قرآن مجید میں ان آٹھ مصارف کو الگ الگ بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوتی! جبکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مصارفِ صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا بلکہ خود ہی آٹھ مصارف متعین فرما دیے۔ تو اگر ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہوتیں اور ان میں سے ہر قسم کی نیکی کے کام میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے کی اجازت ہوتی تو نبی کریم ﷺ کی حدیث کا بالکل غلط ہونا لازم آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''فی سبیل اللہ'' کے لغوی ترجمہ سے جو عام طور پر عموم سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں بلکہ مراد وہ ہے جو حضور اکرم ﷺ کے بیان' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تصریحات اور فقہاءِ اُمت کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں فقہاء کرام کی ان تصریحات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے۔

جیسا کہ روح البیان میں ہے:

فالعدول عن الام للدلالۃ علی ان استحقاق الاربعۃ الاخیر لیس لذواتھمای لکونھم مکاتبا ومدیوناً ومجاھداً ومسافراً حتی یتصرفوا

فی الصدقة کیف شاوا کالاربعة الاول بل لجھة استحقاقھم کفك الرقبة من الرق وتخلیص الذمة من مطالبة من له الحق والاحتیاج الی ما لیتمکن به من الجھاد وقطع المسافة ووجه الدلالة ان فی قد تستعمل بیان السبب کما یقال عذب فلان فی سرقة لقمة ای سببھا۔

(روح البیان' جلد۳' ص ٤٥٣)

اور''الصاوی''میں ہے:

قال الصاوی انما اضیف الصدقات ای الاصناف الاربعة الاول بالام...... اشارة ان الاربعة الاول یملکونھا ویتصرفون فیھا کیف شاوا۔ (الصاوی' جلد۳' ص ٨١٢)

یہی وجہ ہے کہ ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہاءِ ملت اس بات پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم کو مساجد' مدارس' شفا خانے یا یتیم خانے کی تعمیر میں صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ مزید برآں قرآن کریم میں جا بجا ''ایتاء الزکوٰۃ'' کا حکم مذکور ہے اور ایتاء کے معنی لغۃً وشرعاً اعطاء کے ہیں اور اعطاء کا معنی یہ ہے کہ کسی شے کو اپنی ملک سے نکال کر کسی کو اس طرح عطا کر دینا کہ وہ اس کا مالک ومختار بن جائے' یعنی لینے والا اس پر قابض بھی ہو جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکے اور یہی معنی تملیک کا ہے۔ نیز عقلاً بھی صدقہ' ہبہ یا عطیہ بغیر تملیک کے محال ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو اپنے گھر دعوت دے اور نعمت کا دستر خوان اس کے سامنے بچھا دے تو یہ اباحت وضیافت کہلائے گا تملیک نہیں کہلائے گی۔ اس لیے کہ دعوت وضیافت کے معنی محض اجازت کے ہیں کہ جتنا چاہے تناول فرمائے' مگر یہ تملیک نہیں' اس لیے کہ مہمان کو اس میں تصرف کا اختیار نہیں کہ جس کو چاہے دستر خوان سے کھانا اٹھا کر ہبہ کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ محض دعوت وضیافت سے بالاجماع زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کھانا پکا کر کسی شخص کو دے دیا جائے بایں طور کہ وہ کھانے کو اپنے گھر لے جائے اور جس کو چاہے جتنا چاہے کھلائے تو یہ تملیک ہے۔ چنانچہ احناف کے نزدیک ادائے زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ مستحق کو تملیکاً دے دی جائے۔ جیسا کہ فتاویٰ شامی میں ہے:

ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحة

(فتاویٰ شامی' جلد۳' ص ٣٤٤)

جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

فهی تملیك مال من فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه (فتاویٰ عالمگیری' جلد ۱' ص ۱۷۰)

البتہ شدید ضرورت کے وقت زکوٰۃ میں حیلۂ تملیک کے بعد زکوٰۃ کی رقم دینے کی گنجائش ہے۔ نیز مسئلۂ تملیک کے ضمن میں انجمن والوں کا یہ خیال کہ ''لِلْفُقَرَاء'' میں ''لام'' تملیک کے لیے نہیں' یہ بات صحیح نہیں' کیونکہ یہ رائے اکثر مفسرین کے خلاف ہے۔ بہت ساری تفاسیر میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ یہاں ''لام'' تملیک کے لیے ہے۔ جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے:

انه تعالی اثبت هذه الصدقات بلام التملیك للاصناف الثمانیة

(تفسیر کبیر' جلد ۱۵' ص ۱۱۳)

الجامع لاحکام القرآن میں امام شافعیؒ کا قول منقول ہے:

وقال الشافعی :اللام لام التملیك

(الجامع الاحکام القرآن' جلد ۸' ص ۱۰۷)

امام ابوبکر احمد بن علی الجصاصؒ فرماتے ہیں:

ومعلوم ان الله تعالی انما امر بدفع الزكوٰة الی الفقراء لینتفعوا بها ویتملكوها (احکام القرآن للجصاص' جلد ۳' ص ۱۳۸)

تفسیر بیضاوی کے حاشیہ ''محی الدین شیخ زادہ'' میں ''فی الرقاب'' کی تفسیر کے ضمن میں مرقوم ہے:

ولو لم یوت بكلمة "فی" وكان "الرقاب" مجروراً بالعطف علی ما هو مجرور بلام التملیك لكان المعنی ..... الخ

(محی الدین شیخ زادہ' جلد ٤' ص ٤٧٨)

امام علاء الدین علی البغدادی ''تفسیر الخازن'' میں فرماتے ہیں:

انه سبحانه وتعالی اثبت الصدقات للاصناف الاربعة المتقدمة بلام الملك (تفسیر الخازن' جلد ۲' ص ۲۳٦)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تفاسیر میں لامِ تملیک کی صراحت موجود ہے۔ لہٰذا مذکورہ انجمن والوں کا یہ کہنا کہ یہاں ''لا'' تملیکِ ذاتی کے لیے نہیں بلکہ اگر اسلامی حکومت یا اس کی عدم موجودگی میں کوئی ادارہ زکوٰۃ وصول کر لے تو بھی تملیک کی شرط پوری ہو جاتی ہے' یہ بات صحیح

نہیں' کیونکہ حکومت یا اداروں کی جانب سے زکوٰۃ کی وصولی کے بعد حکومت کے لیے اس رقم کو مستحقین تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے اور جب تک زکوٰۃ کی رقم مستحقین تک پہنچا کر ان کی ملکیت میں نہ دے دی جائے اس وقت تک زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے۔ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد جہاد فی سبیل اللہ یا حج بیت اللہ ہے۔ حیلۂ تملیک کے بغیر زکوٰۃ کی رقم کو ان آٹھ معینہ مصارف کے علاوہ دیگر امورِ خیر میں لگانا جائز نہیں۔ اس مقام پر ''لام'' تملیکِ ذاتی کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ باقی ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی رائے جمہور فقہاءِ اُمت کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مسلکہ رسالہ کی تمام تر تحریر میں کوئی معتبر حوالہ پیش نہیں کیا گیا اس لیے بلا حوالہ باتوں کا اعتبار ہی نہیں۔ ایسے ادارے یا انجمن کو جان بوجھ کر زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ ہاں جو حضرات مستحق سمجھ کر دے چکے ہیں ان کی زکوٰۃ ادا ہوگئی ہے اور جن لوگوں نے جان بوجھ کر زکوٰۃ دی ان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی' دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے۔ عوام پر لازم ہے کہ ایسے نظریات وافکار رکھنے والے اداروں یا انجمنوں یا شخصیات کی مدد نہ کریں۔ البتہ صدقات وخیرات کے ذریعے اُمورِ خیر میں تعاون کر کے اپنی عاقبت کو سنوارا جاسکتا ہے۔ فقط

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ

سید فیصل ندیم عفی عنہ

متخصص فی الفقہ الاسلامی

دارالافتاء' جامعۃ العلوم الاسلامیہ' علامہ بنوری ٹاؤن' کراچی

۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ بمطابق ۲۰ مئی ۲۰۰۳ء

الجواب صحیح

محمد عبدالمجید دین پوری' نائب رئیس دارالافتاء

جامعۃ العلوم الاسلامیہ' علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

الجواب صحیح

محمد انعام الحق

تیسرا جواب:

''فی سبیل اللہ'' و ''ابن السبیل'' کے مصداق کی تحقیق

ل: زکوٰۃ کے ساتویں مصرف ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق جمہور علماء کے نزدیک جہاد ہی ہے' اگرچہ امام محمدؒ کے نزدیک حج ہے' اور ایک قول امام احمدؒ کا بھی یہی ہے' لیکن امام احمد کا صحیح قول وہی ہے جو جمہور علماء کا ہے' بہرحال جمہور علماء کے نزدیک ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ''جہاد'' ہے' حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

(۱) فی الدر المختار :وفی سبیل الله وهو منقطع الغزاة وقیل :الحاج (۲۸۹:۳)

(۲) وفی الهدایة مع الفتح : وفی سبیل الله منقطع الغزاة عند ابی یوسف رحمه الله لانه هو المتافهم عند الاطلاق وعند محمد رحمه الله منقطع الحاج (۲۰۵:۲)

(۳) وفی الشرح الصغیر (کتاب فی الفقه المالکی) : ومجاهد کذالك ای حر مسلم غیر هاشمی (۲۶۲:۱)

(٤) وفی حاشیة الدسوقی(کتاب فی الفقه المالکی) : ومجاهد ای المتلبس به ان کان مما یجب علیه (٤۹۷:۱)

(٥) وفی روضة الطالبین (کتاب فی الفقه الشافعی) :الصنف السابع :فی سبیل الله وهم الغزاة الذین لا رزق لهم فی الفیء (۳۲۱:۲)

(٦) وفی الانصاف (کتاب فی الفقه الحنبلی) : قوله : السابع فی سبیل الله وهم الغزاة الذین لا دیوان لهم فلهم الاخذ منها بلا نزاع (۲۳٥:۳)

(۷) کذا فی کتاب الفروع (٦۲۱:۲)

(۸) وفی فقه الزکوة : قال ابن قدامة :وهذا اصح لان سبیل الله عند الاطلاق انما ینصرف الی الجهاد فان کل ما فی القرآن من ذکر سبیل الله انما ارید به الجهاد الا الیسیر (٦٤۲:۲)

البتہ اختلاف اس بارے میں ہے کہ اس ''مد'' میں فقر وتملیک کا ہونا ضروری ہے یا نہیں' یعنی اس مد میں ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے کیا شرعاً یہ ضروری ہے کہ غازی فقیر ہو' اور کیا غازی کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے یا نہیں؟ چنانچہ مذاہب اربعہ میں سے ادائیگیٔ زکوٰۃ کے

لیے صرف حضرات حنفیہ کے ہاں اس مدّ میں زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جبکہ مجاہد فقیر ہو اور اس کو زکوٰۃ کی رقم یا اس سے خریدی ہوئی چیز کا اس کو مالک بنایا جائے۔ اگر ان دونوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو' مثلاً مجاہد غنی ہو یا زکوٰۃ کی رقم سے اسلحہ وغیرہ خرید اگیا اور مجاہدین کی ملکیت میں دینے کے بجائے اس کو مقصد جہاد کے لیے محفوظ رکھا جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی' جبکہ حضراتِ مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں اس مدّ میں ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے یہ دونوں شرطیں ضروری نہیں' ان کے ہاں نہ فقر شرط ہے اور نہ تملیک۔ ان کے ہاں غنی مجاہد کو زکوٰۃ دینا جائز ہے' نیز زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ جہاد خرید کر ان کے جہاد کے لیے وقف کرنا بھی درست ہے' کہ بوقت ضرورت مجاہدین یہ آلات استعمال کریں' اور ضرورت پوری ہونے کے بعد ان کو واپس کریں..... البتہ حنابلہ کے یہاں اس میں یہ تفصیل ہے کہ ربّ المال (مزکی) خود زکوٰۃ کی رقم سے آلات وغیرہ خرید کر کسی مجاہد کو نہیں دے سکتا' اور نہ ہی ان آلات کو وقف کر سکتا ہے' البتہ اگر یہ رقم امام کو دی جائے' تو امام کو اختیار ہے چاہے تو رقم مجاہد کو دے دے' اور چاہے تو اس سے آلاتِ جہاد خرید کر وہ آلات مجاہد کو تملیکاً دے دے' یا ان کو جہاد کے لیے وقف کر دے۔

عربی عبارات ملاحظہ ہوں:

(١) فی الشامیة : والخلف لفظی للاتفاق علی ان الاصناف کلهم سوی العامل یعطون بشرط الفقر (٣:٢٩٠)

(٢) وفی الهدایة مع الفتح : ولا یصرف اِلی اغنیاء الغزاة عندُنا لان المصرف هو الفقراء (٢:٢٠٥)

(٣) وفی فتح القدیر : ثم لا یشکل ان الخلاف فیه لا یوجب خلافا فی الحکم للاتفاق علی انه انما یعطی الاصناف کلهم سوی العامل بشرط الفقر فمنقطع الحج یعطی اتفاقا (٢:٢٠٥)

(٤) وفی تبیین الحقائق : ولا یصرف الی غنیهم (١:٢٩٨)

(٥) وفی ملتقی الا بحر مع المجمع : ومنقطع الغزاة عند ابی یوسف والحج عند محمد ان کان فقیرا ومن له مال فی وطنه لا معه (١:٣٢٦)

(٦) وفی الشرح الصغیر (وهو کتاب معروف فی الفقه المالکی) : ومجاهد

كذلك اى حر مسلم غير هاشمي و آله بان يشترى منها سلاح او خيل ليغازى عليها و النفقة عليها من بيت المال فيعطى المجاهد منها ويدخل فيه الجاسوس والمرابط ولو كان غنيا (١:٦٦٣)

(٧) وفى حاشية الدسوقى (كتاب فى الفقه المالكى) : وآلته كسيف ورمح تشترى منها ولو كان المجاهد غنيا حين غزوة (قوله : وآلته) لا يشترط فيها ان يكون المقاتل بها غير هاشمي لانها تبقى للجهاد ولا يأخذها (١:٤٩٧)

(٨) وفى شرح الزرقانى (كتاب فى الفقه المالكى) :ويشترى له بها كلها آلته ولو غنيا كجاسوس (٢:١٧٩)

(٩) كذا فى شرح منح الجليل (كتاب فى الفقه المالكى) : (١:٣٧٥)

(١٠) وفيه : لا تصرف الزكاة فى بناء او ترميم سور اى بناء حول البلد يمنع العدو من دخولها ولا فى عمل مركب اى سفينة يقاتل بها العدو فى البحر هذا قول ابن بشير وقال ابن عبد الحكم :يعمل الاسوار والمراكب منها واقتصر عليه اللخمى واستظهره فى التوضيح ابن عبد السلام هو الصحيح المواق لم ار المنع لغير ابن بشير فضلا عن تشهيره (١:٣٧٥)

(١١) وفى روضة الطالبين (كتاب فى الفقه الشافعى) للامام الخيار ان شاء دفع الفرس والسلاح الى الغازى تمليكا' وان شاء استأجر له مركوبا وان شاء اشترى خيلا من هذا السهم ووقفها فى سبيل الله تعالى فيعيرها اياها وقت الحاجة' فاذا انقضت استرد (٢:٣٢٧)

١٢) وفى المجموع شرح المهذب (كتاب فى الفقه الشافعى): ويعطى الغازى مع الفقر والغنى للحديث السابق ولان فيه مصلحة للمسلمين ...... ويعطى ما يشترى به الفرس ان كان يقاتل فارسا وما يشترى به السلاح وآلات القتال ويصير ذلك ملكا للغازى ويجوز ان يستاجر له الفرس والسلاح من مال الزكوة (الى قوله:) قال الخراسيون : الامام بالخيار ان شاء سلم الفرس والسلاح والآلات الى الغازى او ثمن ذلك تمليكا له فيملكه وان شاء استاجر ذلك له وان شاء اشترى من سهم سبيل الله سبحانه وتعالى افراسا وآلات

الحرب وجعلها وقفا فی سبیل الله ویعطیهم عند الحاجة ما یحتاجون الیه ثم یردونه اذا انقضت حاجتهم (٦:٢١٣)

(١٣) وفی الانصاف (فی الفقه الحنبلی) : فائدة :لا یجوز للمزکی ان یشتری له الدواب والسلاح ونحوهما علی الصحیح من المذهب' قال الزرکشی : هذا اشهر الروایتین فیجب ان یدفع الیه المال (٣:٢٣٥)

(١٤) وفی کتاب الفروع (فی الفقه الحنبلی): فیدفع الیهم کفایة غزوهم وعودهم ولو مع غناهم (٢:٦٢١)

(١٥) وفی المغنی (فی الفقه الحنبلی) : وقد روی ابوداود باسناده عن عطاء بن یسار عن النبی ﷺ انه قال : لا تحل الصدقة لغنی الا لخمسة لغاز فی سبیل الله (٢:٦٥٥)

(١٦) وفی مطالب اولی النهی (فی الفقه الحنبلی): وذکر فی غایة المنتهی وشرحه: انه یجوز للامام ان یشتری من مال الزکاة فرسا ویدفعها لمن یغزو علیها ولو کان الغازی صاحب الزکاة نفسه لانه بریٔ منها بدفعها للامام کما یجوز له ان یشتری منها ایضاً سفنا ونحوها للجهاد (٢:١٤٧)

(١٧) وفی فقه الزکاة :وانفرد ابوحنیفة باشتراط الفقر فی المجاهد (٢:٦٤٤)

ب: ''ابن السبیل'' سے باتفاق ائمہ اربعہؒ مسافر مراد ہے' اور اس سلسلہ میں تمام ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ جس جگہ مسافر ہو وہاں پر اس کے پاس مال نہ ہو' اگر چہ اپنے وطن میں وہ صاحبِ مال ہو' اگر چہ دیگر بعض شروط میں ان کے آپس میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ''فی سبیل اللہ'' میں صرف حضرات حنفیہؒ کے ہاں فقر کی شرط ہے' اور ''ابن السبیل'' میں حالت سفر میں فقر بالاتفاق شرط ہے اور وطن میں اس کا فقیر ہونا ضروری نہیں' اور ایک فرق یہ ہے کہ ''ابن السبیل'' کے لیے صرف بقدر حاجت زکوٰۃ لینا درست ہے' حاجت سے زیادہ لینا جائز نہیں' بخلاف عام فقیر کے۔

(١) فی الدر المختار : وابن السبیل وهو من له مال لا معه ' وفی الشامیة : هو المسافر سمی به للزومه الطریق زیلعی ..... وقال فی الفتح ایضاً : ولا یحل له ای لابن السبیل ان یاخذ اکثر من حاجته ..... قلت : وهذا بخلاف الفقیر فانه

يحل له ان ياخذ اكثر من حاجته وبهذا فارق ابن السبيل (٣:٢٦٣)

(٢) وفي الشامية :قوله : لا يملك نصاباً ' قيد به لان الفقر شرط في الاصناف كلها الا العامل وابن السبيل اذا كان له مال في وطنه بمنزلة الفقير (٣:٣٦١)

(٣) وفي الهندية :ومنها ابن السبيل وهو الغريب المنقطع عن ماله كذا في البدائع جاز الاخذ من الزكاة قدر حاجته ولم يحل له ان ياخذ اكثر من حاجته (١:١٨٨)

(٤) وفي الشرح الصغير :وابن سبيل وهو الغريب كذلك اى حر مسلم غير هاشمي وهو محتاج لما يوصله لوطنه اذا سافر من وطنه (١:٦٦٣)

(٥) وفي الانصاف :قوله :الثامن ابن السبيل : وهو المسافر المنقطع به هذا المذهب وعليه الاصحاب (٣:٢٣٦)

(٦) وفي روضة الطالبين : ابن السبيل: وهو شخصان' احدهما من انشأ سفرة من بلده او من بلد كان مقيما به والثاني الغريب المجتاز بالبلد فالاول يعطى قطعا وكذا الثاني على المذهب..... ويشترط ان لا يكون معه ما يحتاج اليه في سفره فيعطى ' من لا مال له اصلاً ' كذا من له مال في غير البلد المنتقل اليه منه (٢:٣٢١)

(٧) وفي فقه الزكوٰة : اولها (الشروط) ان يكون محتاجا في ذلك الموضع الذى هو به الى ان يوصله الى وطنه فان كان عنده ما يوصله فلا يعطى (٢:٦٧٨)

والله تعالىٰ اعلم وعلمه اتم واحكم

عصمت اللہ عصمہ اللہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی

٩-٥-١٤٢٢ھ

الجواب صحیح

☆احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

☆مفتی محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

☆مفتی عبدالرؤف دارالافتاء دارالعلوم کراچی

اس فتویٰ کی عربی عبارات کے تراجم بالترتیب درج ذیل ہیں:

(۱) ''(فقہ حنفی کی معروف کتاب) ''درمختار'' میں ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد غازی ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد حاجی ہیں۔''

(۲) ''(فقہ حنفی کی معروف کتاب) ''ہدایہ'' میں ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد امام ابو یوسف کے نزدیک غازی ہیں' کیونکہ آیت کے اطلاق سے یہی بات سمجھ آ رہی ہے' جبکہ امام محمد کے نزدیک ''فی سبیل اللہ'' سے مراد حاجی ہیں۔''

(۳) ''(فقہ مالکی کی معروف کتاب) ''شرح الصغیر'' میں ہے کہ اسی طرح ایسا مجاہد بھی زکوٰۃ کے مصارف میں شامل ہے جو کہ آزاد مسلمان اور غیر ہاشمی ہو۔''

(٤) ''(فقہ مالکی کی کتاب) ''حاشیہ الدسوقی'' میں ہے کہ مجاہد بھی زکوٰۃ کے مصارف میں شامل ہے۔''

(٥) ''(فقہ شافعی کی کتاب) ''روضۃ الطالبین'' میں ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کی ساتویں قسم ''فی سبیل اللہ'' ہے اور اس سے مراد وہ غازی ہیں کہ جن کا مال فَے میں کوئی حصہ مقرر نہ کیا گیا ہو۔''

(٦) ''(فقہ حنبلی کی کتاب) ''الانصاف'' میں ہے: زکوٰۃ کے مصارف کی ساتویں قسم ''فی سبیل اللہ'' ہے جس سے مراد وہ غازی ہیں جو باقاعدہ رجسٹرڈ نہ ہوں تو ان کے لیے زکوٰۃ سے لینا جائز ہے۔''

(۷) ''یہی فتویٰ ''کتاب الفروع'' میں بھی ہے (جو فقہ حنبلی کی ایک معروف کتاب ہے)۔''

(۸) ''ابن قدامہ نے ''فقہ الزکوٰۃ'' میں اس قول کو اصح کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں جب فی سبیل اللہ کا لفظ مطلق طور پر بیان ہو تو اس سے مراد جہاد ہوتی ہے سوائے چند ایک مقامات کے۔''

(۱) ''فتاویٰ شامیہ'' میں ہے: اس مسئلے میں اختلاف لفظی ہے' کیونکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ عاملین زکوٰۃ کے علاوہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ہر مصرف کے لیے فقر کی شرط ضروری ہے۔''

(۲) ''ہدایہ میں ہے: ہمارے نزدیک یہ زکوٰۃ غنی مجاہدین پر خرچ نہ ہوگی بلکہ اس کا مصرف فقراء مجاہدین ہوں گے۔''

(۳) ''فتح القدیر'' میں ہے: پھر یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ اس میں اختلاف سے حکم میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ عاملین زکوٰۃ کے علاوہ باقی تمام مصارف کے لیے فقراء کا ہونا شرط ہے۔ حاجی کے بارے میں بھی اتفاق ہے کہ اس کو بھی زکوٰۃ دی جائے گی۔''

(٤) ''تبیین الحقائق'' میں ہے کہ زکوٰۃ کا مال اغنیاء پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔''

(٥) ''ملتقی الابحر'' میں ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد امام ابو یوسف کے نزدیک غازی ہیں' جبکہ امام محمد کے نزدیک حج ہے' اگر وہ فقیر ہے' یا پھر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جس کے پاس اس کے وطن میں تو مال ہو لیکن فی الوقت موجود نہ ہو۔''

(٦) ''(فقہ مالکی کی معروف کتاب) ''شرح الصغیر'' میں ہے کہ مجاہد بھی مصارف زکوٰۃ میں شامل ہے جو کہ مسلمان آزاد اور غیر ہاشمی ہو' اور یہ بھی جائز ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے آلات حرب یعنی اسلحہ یا گھوڑے خریدے جائیں تاکہ ان کو جنگ کے لیے استعمال کیا جائے۔ بیت المال سے اس مقصد کے لیے رقم خرچ کرنا جائز ہے۔ اس میں سے مجاہد کو بھی دیا جائے گا اور اس مد میں جاسوس اور پہرے دار بھی شامل ہیں چاہے وہ غنی ہی کیوں نہ ہوں۔''

(۷) ''(فقہ مالکی کی کتاب) ''حاشیہ الدسوقی'' میں ہے: مال زکوٰۃ کو دوران جنگ تلوار اور نیزے وغیرہ خریدنے

کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے' چاہے مجاہد غنی ہی کیوں نہ ہو۔ اور آلات حرب کے لیے مالِ زکوٰۃ کو استعمال کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ غیر ہاشمی ہونے کی بھی شرط لگائی جائے' کیونکہ ہاشمی بھی اگر ہو تو وہ ان آلاتِ حرب سے نہ لے گا بلکہ یہ آلاتِ حرب جہاد کے لیے باقی رہیں گے۔''

(۸) ''(فقہ مالکی کی کتاب) ''شرح زرقانی'' میں ہے: اور مالِ زکوٰۃ سے مجاہد کے لیے ہر قسم کے آلاتِ حرب خریدے جائیں گے چاہے مجاہد غنی ہی کیوں نہ ہو' مثلاً جاسوس وغیرہ۔''

(۹) ''(فقہ مالکی کی کتاب) ''شرح مختصر الجلیل'' میں بھی یہی فتویٰ ہے۔''

(۱۰) ''شرح مختصر الجلیل'' میں ہے کہ زکوٰۃ کو فصیل بنانے یا اس میں ترمیم کرنے یا شہر کے باہر کوئی ایسی دیوار بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا جس کے ذریعے دشمن کو شہر میں داخل ہونے سے روک دینا مقصود ہو۔ اور نہ ہی زکوٰۃ کو کسی سواری کے لیے استعمال کیا جائے گا' مثلاً کشتی جس کے ذریعے مجاہد سمندر میں دشمن سے جنگ کرتا ہے۔ یہ ابن بشیر کا قول ہے۔ ابن عبدالحکم کا قول ہے کہ زکوٰۃ کے مال سے فصیل بھی بنائی جا سکتی ہے اور کشتیاں بھی۔ لخمی نے بھی اس قول پر اکتفا کیا ہے اور ابن عبدالسلام نے ''توضیح'' میں اسی کو راجح قرار دیا ہے اور یہی قول ''مواق'' کے مطابق صحیح ہے۔ میرے علم کی حد تک اس سے ابن بشر کے علاوہ کسی نے منع بھی نہیں کیا چہ جائیکہ کہ اس کو عام کرتا۔''

(۱۱) ''(فقہ شافعی کی کتاب) ''روضۃ الطالبین'' میں ہے: امام کے پاس اختیار ہے چاہے تو گھوڑے اور اسلحہ غازی کو دے دے اور اس کو ان کا مالک بنا دے اور اگر چاہے تو اس کے لیے سواری اجرت پر لے لے' یا اگر چاہے تو اس رقم سے گھوڑے خرید کر فی سبیل اللہ وقف کر دے اور ضرورت کے وقت ان کو ادھار بھی دے سکتا ہے اور جب حاجت ختم ہو جائے تو واپس لے لے۔''

(۱۲) ''(فقہ شافعی کی کتاب) ''مجموع شرح مہذب'' میں ہے کہ غازی کو اس میں سے حصہ دیا جائے گا چاہے وہ غنی ہو یا فقیر' جیسا کہ پچھلی حدیث میں بیان ہوا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں عام مسلمانوں کی مصلحت بھی شامل ہے۔ یا غازی کو اتنی رقم دی جائے گی کہ وہ اس سے گھوڑا خرید سکے یا آلات قتال یا اسلحہ وغیرہ اور یہ غازی کی ملکیت بن جائے گی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ زکوٰۃ کی اس رقم سے گھوڑا' اسلحہ وغیرہ غازی کے لیے اجرت پر لیا جائے۔ خراسیون نے کہا ہے کہ امام کو یہ اختیار حاصل ہے اگر چاہے تو گھوڑا اسلحہ اور آلاتِ حرب وقتال غازی کے حوالے کر دے یا اس کی قیمت کا اس کو مالک بنا دے یا اس کے لیے یہ چیزیں اجرت پر حاصل کرے' اور اگر چاہے تو فی سبیل اللہ کی مد سے گھوڑے اور آلاتِ حرب خریدے اور ان کو اللہ کے راستے میں وقف کر دے اور ضرورت کے وقت غازیوں کو وہ چیزیں فراہم کرے جن کی ان کو ضرورت ہے اور جب ان کی ضرورت ختم ہو جائے تو وہ امام کو وہ چیزیں واپس کر دیں۔''

(۱۳) ''انصاف'' میں (فقہ حنبلی کا موقف) ہے کہ ربّ المال کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جانور اور آلات وغیرہ خریدے اور یہی رائے صحیح ہے۔ امام زرکشی نے کہا ہے کہ اس بارے میں دو روایات ہیں جن میں سے مشہور یہ ہے' اس لیے ربّ المال کے لیے ضروری ہے کہ امام کو اپنی زکوٰۃ دے۔''

(۱۴) ''فقہ حنبلی کی ''کتاب الفروع'' میں ہے کہ امام غازیوں کو ان کی ضرورت و حالات کے مطابق مالِ زکوٰۃ سے دے گا چاہے وہ غنی ہی کیوں نہ ہوں۔''

(۱۵) ''(فقہ حنبلی کی کتاب) ''مغنی'' میں ہے کہ ابوداؤد نے عطاء بن یسار سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''غنی کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے مگر پانچ وجوہات سے' پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا ہو۔''

(۱۶) ''(فقہ حنبلی کی کتاب) ''مطالب اولی النہی'' میں ہے اور اسی طرح غایۃ المنتہی اور اس کی شرح میں ہے کہ امام کے لیے جائز ہے کہ وہ مال زکوٰۃ سے گھوڑے خریدے اور غازیوں کے حوالے کردے جو ان پر بیٹھ کر جنگ کریں چاہے وہ غازی صاحب نصاب ہی کیوں نہ ہو' کیونکہ امام نے یہ مال اسے دیا ہے اس لیے وہ غازی اب اس کے بارے میں بریٔ الذمہ ہے۔ اسی طرح امام کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ مال زکوٰۃ سے کشتیاں وغیرہ خریدے۔''

(۱۷) ''فقہ الزکوٰۃ'' میں ہے کہ مجاہد کے بارے میں فقیر ہونے کی شرط لگانے میں امام ابوحنیفہ منفرد ہیں۔

(۱) ''درمختار'' میں ہے: ابن سبیل سے مراد وہ ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو۔ فتاویٰ شامیہ میں ہے کہ وہ مسافر ہے' اس کو ابن السبیل کا نام اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ راستے سے چمٹا رہتا ہے۔ امام زیلعی نے فتح المجید میں یہ بھی کہا ہے کہ ابن السبیل کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد مال زکوٰۃ میں سے لے..... میں یہ کہتا ہوں کہ یہ فقیر کے برعکس معاملہ ہے' کیونکہ فقیر کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد مال لے' یہی ابن السبیل اور فقیر میں فرق ہے۔''

(۲) ''شامیہ'' میں ہے کہ وہ نصاب کا مالک نہ ہو' کیونکہ عاملین زکوٰۃ کے علاوہ باقی تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر شرط ہے۔ ابن السبیل اگرچہ اپنے وطن میں مال والا ہو لیکن اسے فقیر ہی شمار کیا جائے گا۔

(۳) ''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے: زکوٰۃ کے مصارف میں ابن السبیل بھی ہے اور اس سے مراد مسافر ہے جس کے پاس مال نہ ہو۔ اسی طرح بدائع الصنائع میں بھی ہے کہ ابن السبیل کے لیے اپنی ضرورت کے مطابق زکوٰۃ کے مال میں سے لینا جائز ہے اور اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد مال لے۔''

(۴) ''شرح الصغیر'' میں ہے کہ ابن السبیل سے مراد مسافر ہے یعنی آزاد مسلمان اور غیر ہاشمی ہو' کیونکہ مسافر کو اتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے وطن واپس جا سکے۔''

(۵) ''انصاف'' میں ہے: (مصارف زکوٰۃ میں) آٹھویں قسم ابن السبیل ہے' اور اس سے مراد مسافر ہے یہی ہمارا مذہب ہے۔''

(۶) ''روضۃ الطالبین'' میں ہے کہ ابن السبیل دو شخص ہیں' ایک وہ کہ جس نے اپنے شہر سے یا اس شہر سے کہ جس میں وہ مقیم تھا' سفر کا آغاز کیا' اور دوسرا وہ مسافر جو کہ شہر سے گزرنے والا ہے۔ پہلے کو قطعی طور پر دیا جائے گا اور دوسرے کے بارے میں اہل مذہب کا یہی قول ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ مسافر کے پاس وہ مال نہ ہو کہ جس کا وہ اپنے سفر میں محتاج ہو۔ پس ایسے مسافر کو مال زکوٰۃ سے دیا جائے گا جس کے پاس اصلاً مال نہ ہو یا اسی طرح جس مسافر کے پاس اس شہر میں مال نہ ہو جس شہر کی طرف وہ منتقل ہوا ہے۔''

(۷) ''فقہ الزکوٰۃ'' میں ہے کہ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اس جگہ میں محتاج کی حیثیت سے ہو اور اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اسے اس کے وطن پہنچا دے۔ اگر اس کے پاس اتنا مال ہوگا تو اسے مال زکوٰۃ میں کچھ بھی نہ دیا جائے گا۔''

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے

رجوع الی القرآن کورس

میں داخلے کے لیے طالبانِ قرآن سے درخواستیں مطلوب ہیں!

تعلیم یافتہ حضرات کے لیے قرآن حکیم کو سمجھنے اور فہم دین کے حصول کا سنہری موقع

یہ کورس بنیادی طور پر گریجوایٹس اور پوسٹ گریجوایٹس کے لیے ترتیب دیا گیا ہے' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم گریجوایشن کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' انہیں اس کورس کے ذریعے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے ـــــ تاہم بعض استثنائی صورتوں میں ایف اے کی بنیاد پر بھی اس کورس میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

نصاب

۱) عربی صرف ونحو
۲) ترجمہ قرآن (تقریباً پانچ پارے)
۳) آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل (تقریباً دو پارے)
۴) قرآن حکیم کی فکری وعملی راہ نمائی (منتخب دروس قرآن)
۵) تجوید وحفظ
۶) مطالعۂ حدیث
۷) اصطلاحاتِ حدیث
۸) اضافی محاضرات

o کورس کا آغاز ان شاء اللہ ستمبر کے پہلے ہفتے سے ہوگا اور کورس کا دورانیہ نو (9) ماہ ہوگا۔

کورس کا تفصیلی پراسپکٹس

جس میں داخلے سے متعلق ضروری معلومات کے علاوہ کورس میں شامل مضامین کی تفصیل' طریق تدریس اور نظام الاوقات کی وضاحت بھی شامل ہے' درج ذیل پتے سے حاصل کریں:

ناظم برائے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور (فون: 03-5869501)